اوراقِ پریشاں

مصنف
پرمانند المست
جموی

قیمت ۔ دو روپے

یہ کتابچہ میں اپنے اُستاد شری برج
لال جی جنڈیال مرحوم کے نام
منسوب کرتا ہوں

دیباچہ

اوراق پریشان کہیں سے جستہ جستہ دیکھا ہے اگر یہ کہوں کہ یہ اوراق
المست، کی کتاب زندگی کے اوراق پریشان میں سے فقط ایک ورق کی منہ
بولتی تصویر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ دنیا کی اسٹیج پر بچپن اور جوانی کے بے فکر
تماشوں میں المست کا ذوق سلیم تماشا بن کر بھی تماشائی رہتا ہے ان
اوراق کا مطالعہ تماشا اور تماشائی کی نسبت سے اُن تاثرات کی گہری
چھاپ کا حامل ہے۔ جو قاری کا ذہن قبول نہ کرنے کی باوجود قبول کرنے
پر مجبور ہوگا۔ کیوں کہ فطرت انسان کا یہ تقاضا ہی ہے
المست کو اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے اس نے جو دیکھا جو سنا
اور جو کیا سیدھی سادھی زبان میں لکھ دیا۔ اس لحاظ سے اس کتاب میں زبان
و بیان کی خوبیاں تو کیا خامیاں بھی شاید قابل عفو نہ ہوں لیکن یہ بات
یقیناً قابل داد ہے کہ المست نے، جو بات کی خدا کی قسم لاجواب
سی تپتے کی باتیں کان میں ہیں نوک قلم سے برسر عام کہہ دیں باتیں پرانی
ہیں۔ انداز بیان کا اسلوب بھی پرانا ہے۔ لیکن صدیوں کے تاریخی حقائق
اگر ماضی ماضی کہہ کر نظر انداز کئے جائیں تو نئی تاریخ کے نفسیاتی تجزیئے

"پرانے تجربہ" کی بنیادوں پر قائم نہیں کئے جا سکتے بس یہی نکتہ المست کے اوراق پریشان کے مطالعہ کی بنیادی قدر و قیمت کا بلند معیار رکھتا ہے۔

المست ڈوگری شاعر ہے نیچرل شاعری اس کی گھٹی میں ہے اردو کی نسبت ڈوگری میں کہنا اور لکھنا اس کے لئے آسان ہے اردو میں المست کی شاید یہ پہلی کوشش ہے اور کہا نہیں جا سکتا کہ یہ کوشش کامیاب ہے یا ناکامیاب لیکن اس لحاظ سے قابل داد ہے کہ تماشا بن کر بھی اور تماشائی بنکر بھی جو دیکھا وہی لکھ دیا۔ اوراق پریشاں افسانہ، کہانی یا ناول یا ادبی تصنیف نہیں۔

یہ المست کی آپ بیتی ہے اور آپ بیتی کو آپ بیتی ہی کے تصور میں پڑھنے والے یقیناً اوراق پریشان سے پریشان نہیں بلکہ لطف اندوز ہوں گے۔

مجھے المست کے مخیانہ مستی سے فقط ایک تماشائی کسی شناسائی کا حرب حاصل رہا۔ اکثر المست کی ڈوگری شاعری تسکین ذوق کا سامان بھی نام پہچانتی رہی اور اس سلسلہ میں کلام شاعر بہ زبان شاعر کے لحاظ سے ان کی زندگی کے کچھ واقعات بھی گوش پذیر ہوتے رہے "ایک انسان اگر گل صد رنگ یا ہزار داستان کا مجموعہ ہو سکتا ہے تو المست کی زندگی بھی شاید پوئے ہر گل "کی تفسیر ہو سکتی ہے لیکن المست آپ کیا ہے یہ شاید المست کے اوراق پریشان بھی ظاہر کرنے سے معذور ہیں اس لئے اس کا جواب المست کو اپنے ہی " خمخانہ المست" کے بادہ خم میں ڈھونڈنا

چاہیے۔

المستؔ کا نام "پرمانند" ہے جو آپ ہی پرم آنند ہو وہ تخلص بھی المستؔ رکھے بات کچھ جچی نہیں۔ پھر اس لئے بھی کہ تخلص فارسی نژاد اور کلام خالص ڈوگری بالکل گنگا فرات کا میل ہے لطف یہ کہ اس دو میل کے سنگم سے جو سنگ میل قائم ہوا ہے۔ وہ المستؔ کے ڈوگری کلام کی اشاعت ہے۔ جس کے لئے المستؔ کی یار آور کوششیں قابل ستائیش ہیں اوراق پریشان غالباً اسی کاروان کا "بدرقہ" ہے ظاہر ہے حد اطوطی کی سنتا کون ہے نقارخانے میں "ناقہ لیلےٰ" کی گھنٹی کی آواز مجنوں کے کان ہی سنتے تھے۔ ہر ایک کے نہیں۔ اس لحاظ سے المستؔ کی شاعری پسند کرنے والے اگر المستؔ کی آپ بیتی کے تاثرات میں خصوصاً۔ ہر مندر میں ہر بھگوان "کے روپ کیرتن اور بھجن" کے پس پردہ ڈھولک کے گیت" سننے کی کوشش کریں تو وہ المستؔ کے تجربات میں وہ سب کچھ پائیں گے جو ملمع کے نیچے سچائی کی صورت ہو سکتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا میں المستؔ کی ہر ادا کا خریدار ہوں اور مجھے المستؔ جو کہے اسے سچ کہنا چاہیے۔ میں دما دم مست قلندری کا بھی قائل نہیں نہ میں زاہد خشک ہوں نہ المستؔ کو حرص و ہوا کی قید سے آزاد سمجھتا ہوں وہ بھی دار ہے میں بھی ہوں وہ بھی کسی روحانی سہارے کا قائل ہے میں بھی خدا کی خدائی سے منکر نہیں پھر بات سے بات نکلی کے اعتبار سے اگر میں اس کے تجربات زندگی کو مشعل راہ نہ سہی محض تفنن طبع کیلئے سراہتا ہوں اور قدر کرتا ہوں تو یہ کوئی احسان نہیں۔ بلکہ سچائی کی تلاش ہے

ڈی۔ ایس۔ نیور (ٹیچر)

اپنی اُدھیڑ بن نہ گئی بعد مرگ بھی
ہم قبر میں بھی تار کفن سا تھتے رہے

اوراق پریشاں

ایم یا سمتی ہے یہ مسودہ میں نے سنہ ۱۹۲۷ء کو مکمل کیا تھا۔ یہ مسودہ سمجھو یا میری زندگی کے کچھ ناچیز تجربات"

استاد شری برج لال جی جنڈیال کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کیا۔ انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اور فرمایا "شاباش تم نے ایک حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ یہ مسودہ ایک نہ ایک دن دنیا کے لیے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگا جو کچھ قلم بند کیا ہے۔ ملک اور قوم کے واسطے بہت مفید ہوگا۔

عالم اور باہمہ استاد کے اتنے مہربان الفاظ سن کر کون [illegible] ہے؟

جس کو خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن اشاعت کے بارے میں کیا عرض کروں پریشانیوں
میں اضافہ ہوا۔ کوشش جاری رہی بہت سر ٹپکا باریابی نہ ہوئی ادبی دوستوں
کو مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے مسودہ کو الف
سے یے تک پڑھا۔ سب نے پسند فرمایا۔ چند اصحاب کے ارشادات
مندرجہ ذیل ہیں۔

شری دھن ونتری جی :-

یہ مسودہ لینن کے دھرم کے پرتی وچاروں کا ترجمان معلوم ہوتا ہے

موہن یاور :-

اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہیئے کارآمد چیز ہے

دیانند کپور ریڈیو آرٹسٹ جموں

" یہ تحریر سمندر کو کوزے میں بند کرتی ہے۔

ڈاکٹر سیتارام سکرٹری آریہ سماج جموں

یہ مسودہ شری آنند سوامی جی سے ملاحظہ کروائے جانے کے بعد
ان کے زریں اقوال سے اس طرح آگاہ فرمایا۔
" کہ اس کی تحریر کرنے والے نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور
کئی باتیں اس میں ایسی ہیں جو کہ سوامی دیانند جی بھی نہ تحریر فرما سکے اور
موجودہ دور کے واسطے قوم اور ملک کے لئے ایک روشنی ہے رو ڈھی
باد کا پول کھولنے کے لئے بڑھ چڑھ کر صاف گوئی سے کام لیا ہے۔
اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہیئے۔ بگڑے ہوئے سماج کے واسطے

یہ مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔

شری مولانا محمد سعید مسعودی

"میرے عزیز دوست اور عنایت کے دوست ڈاکٹر المست کے
سینے میں خدا نے ایک حساس مند دل کو جگہ دی ہے۔ یہ دل
یہ صرف ایک شاعر کا دل ہے بلکہ خدا سے لو لگانے والے
اور خدا کی سب مخلوق کو ہمدردی کی نظر سے دیکھنے والے
فقیر کا دل ہے۔ اور یہ قدرت کا بڑا عطیہ ہے۔"

برچھی چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے ہی دل میں ہے

امیر

مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ملاقات کا شرف کئی سال سے ہے
اور میں نے ان کی خود نوشت زندگی کے کچھ اوراق بھی آج سے پانچ چھ
سال قبل پڑھے تھے۔ آپ نے بعض ایسے تجربے قلمبند کئے ہیں
جن کو منتخب کر کے اگر شائع کر دیا جائے۔ تو پڑھنے والوں کو آجکل کے
گھپ اندھیرے میں روشنی کی شمع کا کام دے سکتے ہیں۔ آج جب کہ میں
سیاسی ہنگاموں کی دنیا سے دور ایک گوشۂ گمنامی میں سر چھپائے
ماضی کو بھول ڈالنے میں مصروف ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے
میرے لئے بڑی بھاری قیمت رکھتے ہیں۔

"اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"

محمد سعید مسعودی ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء گاندھربل کشمیر

ٹھاکر گنگا دتہ جی بی۔ اے پریذیڈنٹ اڈوگرہ منڈل جموں

"میں نے مصنف انتہی پرمانند الست کا مسودہ اوراق پریشاں الف سے ے تک پوری توجہ سے اور دلچسپی سے پڑھے۔ میری رائے ہے کہ مصنف صاحب نے قابل اور تجربہ کار جراح کے طور پر ہندو سماج کے قالب ان حصوں پر جہاں فاسد خون کے ناسور رہ رہے تھے۔ اپنے بہترین نشتر سے ایسا چرکہ لگایا ہے جو مریض کی دائمی صحت کی بحالی کا ضامن ہوگا۔ بشرطیکہ مریض اس سے دانشمندی اور احتیاط سے مستفید ہونے کے لیے آمادہ ہو۔ اور اس پر عمل پیرا ہو۔ میں مصنف صاحب کی صداقت پسندی اور عالی ہمتی کی داد دیتا ہوں۔

تحریر ۹ر نومبر سنہ ۱۹۵۶ء

مولانا عبدالرحمٰن ایم پی جموں کشمیر

"میرے قیام چناب ہوٹل سرینگر کشمیر میں الست صاحب کے تحریر کردہ چند اوراق بڑی دلچسپی سے پڑھنے کا موقعہ ملا میں نے بارہا مطالعہ کیا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مصنف صاحب نے بڑی دیدہ دلیری سے کام لیا ہے۔

میں نے ہی مصنف صاحب کو اس کا نام "دراز پریشاں" رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔

کام سے ہے کام ان کو۔ گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
حالی

شری گردھاری لال ڈوگرہ فائنینس منسٹر جموں و کشمیر
میں نے مسودہ حرف بہ حرف پڑھا۔ موجودہ دور
کے لیے بہت مفید ہے . . . . .

ڈاکٹر سیتا رام سیکریٹری آریہ سماج کالج نہ بھاگ جموں
نے یہاں تک کہہ دیا۔ اگر اس مسودہ کا ہندی (دیوناگری) میں انوواد
کر دو۔ تو ہم سماج کی طرف سے آریہ گزٹ میں سلسلہ وار مضمون
شائع کروا دیں گے۔ اسی امید پر یہ پریشانی کا پٹارا ایک اچھے
ادبی دوست کے سات دن کے وعدے پر سپرد کیا ایک ہفتہ
بس کا برابر ڈیڑھ سال کے بعد واپس کیا۔

بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اسکا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اسکا

خیر! مسودہ نے اپنے نام کی لاج رکھ لی۔ اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے
ہی در در کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے آخر اپنی جماعت ڈوگری سنستھا کی
کی شرن لی۔ تمام ممبروں نے اس کی اشاعت کا وعدہ فرمایا۔ دو سال تک وہاں

ردی کی ٹوکری میں پرورش پاتا رہا۔ بڑی جدوجہد کے بعد واپس مل گیا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے
غالب

محمد ایوب لیکچرار مولانا آزاد کالج جموں

بندہ نے شری المست کے "اوراق پریشاں" کا بغور مطالعہ کیا۔ شری المست نے ہندو سماج کی خامیوں کی جو عکاسی کی ہے۔ وہ قابل داد ہے۔ اُن کا یہ مسودہ ٹھوس تجربات کا مجموعہ ہے اور مجموعہ دور کے تقاضات کے عین مطابق ہے جس بات کو قابل مصنف نے آج سے پچیس سال پہلے محسوس کیا لوگ اسے آج محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ اُن کی دلیرانہ تحریر آج بھی عوام کے لئے فلاح و بہبود کا ایک بہترین نسخہ ثابت ہو سکتی ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
اقبال

ایس ایم خان لیکچرار مولانا آزاد کالج جموں۔

شری المست نے "اوراق پریشاں" میں مذہب سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی پردہ دری کی ہے۔ اُنہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو ترتیب دے کر قابل

...جرأت سے کام لیا ہے۔

رئیس التحریر شری نرسنگداس نرگس "مدیر چاند"

شری پرمانند الست سرزمین ڈوگر کے مایہ ناز ڈوگری زبان کے شاعر ہیں۔ آپ نے اپنی ۴۵ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ لیکن بچپن سے ہی گھریلو مصائب میں مبتلا رہے اور اوراق پریشان بس اِس تلخ زندگی اور تجربہ کا نچوڑ ہے جو کہ ہر ایک کے لئے سبق آموز ہے میں چاہتا ہوں کہ لوگ اِن اوراق کو پڑھ کر الست صاحب کے خیالات سے مستفید ہوں۔

آغاز

ابھی میری عمر کا نواں سال بیت رہا تھا۔ کہ فلک نے میرے باپ کا سایہ سر سے ہٹا دیا۔ بڈھے دادا کی سرپرستی میں پرورش پائی۔ اور بڑی مشکل سے مڈل پاس کیا۔ ماں اکثر بیمار رہا کرتیں ماں کے پیار سے بھی محروم رہا۔ یوں تو کہنے کو تین چچا بھی تھے لیکن اسلئے دشمن۔ کیا ذکر کروں بخوف طوالت وہ جائیداد کے لیے میرے جان لیوا رہے ہے۔

مارنے والے سے رکھنے والا بڑا بے انت ہے

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو ۵

سوزن تدبیر گو ساری عمر سیتا رہے

دادا کو خوش دیکھنے کی خواہش نے مجھے کم سنی میں ازدواجی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ شادی ہونے کی دیر تھی۔ ماں کی نصیحت سے پڑھائی ترک کرنا پڑی۔ ماں اکثر یہی کہا کرتی تھیں۔ کہ پڑھو تا کہ تمہارا بیاہ ہو جائے اور دلہن کو دیکھ کر مروں۔

نے بچے پر ماں کی نصیحت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ شہر کی زندگی۔ اوائل
عمر اور دیکھ بھال کرنے والے ضعیف اور بیمار۔ اِن حالات میں اکثر
نوجوان بگڑ جایا کرتے ہیں۔ بری سنگت کی وجہ سے بری عادتوں
کے جبال میں پھنس گیا۔

مکن بدچو دانی کہ از کار بد
بغیر جام بر بد کنش بد رسد
فردوسی

دادا کوئی امیر کبیر نہ تھے۔ اور نہ ہی کوئی دھندا تھا ہی غیر منقولہ
جائیداد کے کرایہ سے دال روٹی کا گزارہ تھا زمانہ سستا تھا۔ زندگی
کی گاڑی چلتی رہی۔

سنہ ۱۹۷۸ بکرمی۔ دادا جی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت میرے سر
پر چھ افراد کا بوجھ تھا۔ سرکاری نوکر ہو چکا تھا تنخواہ تھی انیس روپے
آٹھ آنے ماہوار۔ دادا کے مرنے کی دیر تھی۔ کہ چچاؤں نے جائیداد
کے واسطے مل کر فوجداری اور دیوانی (فرضی مقدمات) میں جکڑ لیا
خرچ آمدنی سے بڑھ گیا۔ دال روٹی تو چل رہی تھی۔ لیکن دوسری ضروریات
کے لئے قرض ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ انہی اخراجات کی بدولت
جائیداد کو کوڑیوں کے دام فروخت کرنا پڑا۔

اس حقیر سی تنخواہ میں اپنی عادات۔ گھر کے اخراجات کیسے نبھائے
جاتے۔ قرض بھی آسانی سے نہ ملتا۔ ان دنوں میری حالت نہایت
پریشان کن تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ میں خود بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے تپ دق

فتوے دیا۔ غم کے پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑے غریبوں نے روزے رکھے۔ دن بڑے ہوئے کوئی امداد کرنے والا نہ تھا۔ ان حالات میں گھبرا گیا۔ گھبراہٹ بن یا۔ بُرے دنوں میں اگر کوئی امید کی کرن یا جینے کو سہارا ہو سکتا تھا۔ تو صرف ایک ایشور کی یاد اور اُس کی عبادت۔ ے

آ ہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت
کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

جب آدمی ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس لئے میں بھی اپنے مرض بے چینی اور پریشانی سے چھٹکارا پانے کیواسطے یہی طریقہ بروئے کار لانے پر مجبور ہوا۔

تلاش تسکین:۔ یہاں ایک بڑے مندر میں جانا شروع کر دیا۔ بھگوان! جس کا نہ کوئی رنگ نہ روپ۔ کام نہ دھام۔ لامحدود جس کی کوئی حد نہیں لیکن دنیاوی جماعتوں نے اس کو بھی چند اینٹوں اور پتھروں اور سنگ مرمر کے ٹکڑوں میں مقید کر رکھا ہے۔ پرانے خیالات کے زیر اثر مندر میں جانا شروع کر دیا۔ لیکن مندر میں بھی سب ہی کو بے چین دیکھا۔ بھگتوں کو مراد پوری ہونے کی فکر تو پوجاری کو چڑھاوے کی فکر۔ اس مندر میں کیسے پریشان کن واقعات دیکھنے میں آئے۔ سب کا

کا ذکر کرنا بے معنی اور بدمزگی پیدا کرنے کے مترادف ہوگا
اگر میں یہ کہہ دوں کہ مندر اور شوالے یا دیگر دیواستھان
بے کاری پیدا کرنے کے اڈے ہیں کچھ برا نہ ہوگا پہلے عرض
کیا جا چکا ہے۔ کہ کچھ واقعات دیکھے تمام کو چھوڑ کر چند کا ذکر لازمی ہے

ملاپ گھر :-

ان دنوں یہاں ایک بھگت جی مہاراج
ٹھیک صبح سے آیا کرتے۔ گھنٹوں نہیں پہروں "پری کرما" یعنی
گھوما پھیری میں گزار دیتے تھے پجاری جی مہاراج بھی اُن کی کافی سے زیادہ
آؤ بھگت کرتے کیوں نہ ہو؟ "تل تانبہ یہاں سے نرم ہوت تت کال"
میرے جیسے دل جلے کو اُسے دیکھ کر حسد اور رشک بیک وقت آتا
دل میں خیال اٹھتا کہ شری مان بھگت جی سیدھے نارائن کے گھر
بلا روک ٹوک جائیں گے۔ لیکن چند دنوں کے بعد معلوم ہوا۔ کہ آنجناب
ایک اچھے گھرانے کی سندری کے کر تو دو گیارہ ہو گئے۔ بھگت جی
کی مراد بر آئی یہ مندر ہی اُن کے ملنے ملانے اور بات چیت کرنے
کا ایک بہترین ٹھکانا تھا۔

دوسرا واقعہ

بھگوان کے گھر چوری :-

یہ واقعہ بہت مزے دار ہے اس
مندر کا مہنت بڑا عیش پرست اور رنگیلا آدمی تھا۔ تو مندر میں پوجا نہیں

کر نے بلکہ ایک نوکر رکھا تھا۔ اس بیچارے کی حالت قابل رحم تھی۔ چند دنوں تک تو اس نے بڑی دیانتداری سے کام چلایا خوب اعتبار جمایا۔

آخر اس نے چڑھاوے کے پیسے چرائے اور کافی مال جمع کر لیا۔ کہاوت ہے کہ سو دن چور کا ایک دن شاہ کا۔ کانوں کان یہ خبر مہنت جی کو مل گئی۔ ایک دن مہنت نے خفیہ طور چھاپا مارا اور چور کو موقع پر پکڑ لیا اس قسم کے ہزاروں واقعات کئی ایک منچلے ادیبوں نے ڈراموں اور ناولوں میں پیش کئے اور کئی ایک اخباروں میں آئے دن شائع ہوتے آرہے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کئی قسم کے گناہ در پردہ ایسے مقاموں پر ہوتے دیکھے مجھے چین اور استقلال نہ ملنا تھا نہ ملا بلکہ بے چینی میں کچھ اضافہ ہوا۔

"اسے اس مندر کا بھگوان خود مجبور ہے۔ لہٰذا میں نے دوسرے مندر میں جانا شروع کر دیا۔ اس مندر کا مہنت ایک نوجوان خوبصورت ڈیل ڈول والا، مالدار۔ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے والا بیراگی مہاتما تھا۔

اس مندر میں زیادہ تر نوجوان خوبصورت مستورات کی زیادہ آمد تھی مہنت جی بھی مست الست اور بھگتیاں بھی مست۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

سمجھداروں کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر میری عقل دنگ رہتی تھی۔ اس مندر

مندر کو چھوڑ ایک شوالے میں تلاشِ حق کے واسطے جانا شروع کر دیا۔ یہاں کا مہنت، یوں تو شریف سنیاسی تھا۔ لیکن سود خوری اور روپیہ پیسہ جمع کرنے میں ایک بنیئے سے کم نہ تھا۔

ایک دن میں بھگوان آشوتوش کی پوجا کر کے سامنے نندی گن کو دیکھ رہا تھا۔ بھگت سبز سبز گھاس۔ اُس پتھر کے بیل کے آگے ڈال جاتے ہیں۔ میں نے نوکری پر جانا تھا۔ راستہ میں دیکھا کہ اصل بیل میلے کے ڈھیر پر کوڑا کرکٹ کھا رہا ہے ـــــ اپنی قوم کے بھگتوں کی نادانی سمجھ میں آ گئی۔

دوسرے دن جاتے ہی میں نے مہنت جی سے عرض کی کہ آپ کو شوجی کی سواری کے واسطے زندہ بیل رکھنا چاہیئے۔ اور نر سول لگے بیل کا مندر کی آمدنی سے پالن ہونا چاہیئے۔ مندر کی آمدن قومی سرمایہ ہے۔ یہ سرمایہ قوم کی بہبودی کے لئے خرچ ہونا چاہیئے۔ اچھے بیل ہونے سے گو نسل کا سُدھار ہوتا ہے جس سے دودھ کی زیادتی ہوتی ہے۔ اتنی بات سنتے ہی مہنت جی آگ بگولہ ہو گئے۔ جی بھر کر کوسا آپ کوئی ٹھیکیدار ہیں۔ ہم مہنت ہیں۔ ہم کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ـــــ اگر میں وہاں سے نہ بھاگتا تو ڈنڈوں سے بھی مرمت ہو جاتی۔ ؎

کچے ہیں صبوحے ہیں کچھ ہیں جر جرے
رونا نہیں ہے ایک کا آدا بگڑ گیا

اِن مندروں شوالوں میں چین بھگوان نہ ملا۔ مگر ایک بات کا پتہ چل گیا
یہ اینٹ پتھر کے گھڑے ہوئے ایک ڈھنگ سے بنی مورتیاں رام کرشن
مہیش گنیش کلاکاروں کے مبارک ہاتھوں کی محتاج ہیں۔ جو کچھ اِن بتوں
کی پرستش میں ہے۔ وہ اپنا اپنا ہی خیال ہو سکتا ہے۔ اگر اِن بتوں
میں کوئی جلوہ ہوتا تو مجھے چین ملتا۔ بے چینی دور ہوتی۔

اُلٹے لینے کے دینے پڑے۔
بے چینی کی بیل میں نئے شگوفے نکل آئے۔
گھڑی سوچنے اور پوچ لیا
بندر کی بلا طویلے کے سر

یہ مورتیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پتھر مٹی سونا چاندی پیتل کانسی اور کہیں کہیں چوبی مورتیاں بھی ہیں۔
جن کو ہمارے جیسے ہی کاریگر انسان نے بنایا ہے۔ ان کی پوجا ہوتی
ہے۔ ان پتھروں سے علیحدہ ہوئے سنگ مرمر کے ٹکڑاوں سے اور بھی
چیزیں تو بنتی ہیں۔ کوئی فرش پر جڑا ہے اور کوئی یوں ہی راستے کی ٹھوکریں
کھا رہا ہے۔ غرضیکہ گندی سے گندی جگہ پر کام آرہا ہے۔ ایک طرف یہ
دوسری طرف یہ اعتراض پیدا ہوا۔ کہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرکے
بڑے بڑے راجاؤں، مہاراجوں، سیٹھ ساہوکاروں نے اوا ئے
ہوا ہے اور بڑے بڑے پنڈتوں نے شاستری طریقہ سے ان کو
جیو دان دے کر اس لائق بنایا۔ کیا وہ بے جان تھے۔؟ اس پر یہ بڑے

مہاپرشوں کی یاد ہے تمہیں کیا حق ہے کہ ان کی یاد میں اس طرح اناپ شناپ بولو۔

دیکھ جس مندر میں تم نے پہلے جانا شروع کیا تھا۔ کتنا زر کثیر خرچ کر کے بنوایا ہوگا۔ کبھی تیرے جیسے مزدور کی ہے طاقت؟ جو ایسے ادارے بنوا سکے۔ ان خیالوں نے بھی میرے من کو چین نہ دیا۔ الٹا ایک اور لپیٹ میں آ گیا۔

واقعی اگر مندر وغیرہ سرمایہ داروں کے محتاج ہیں تو اور بھی خرابی ہے۔ سرمایہ بغیر "پاپ کمائی" لوٹ کھسوٹ کے جمع نہیں ہوتا۔ اور اس سرمایہ سے یہ ادارے (مندر) وغیرہ بنوائے جاتے ہیں۔ صرف اس غرض کو مدنظر رکھ کر کہ جو کچھ برا بھلا کر کے دھن جمع کیا ہے کسی دھرم کے کام پر لگے اور ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو۔ اور عقل کے اندھے اس آڑ میں ہمیں نیک خیال کریں۔ تاکہ اور زیادہ لوٹ کھسوٹ کرنے کا موقعہ مل جائے۔

منہ میں رام بغل میں چھری

کوئی اچھا مالدار لاولد عدم آباد سدھار جاتے۔ بطور یادگار مندر شوالا وغیرہ تعمیر کیا جاتا ہے۔

شاید چند ایک اپنے اپنے مذہب کے دیوانے بھی ایسا کرتے ہیں۔ لیکن ایک سچا پریمی ایسا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ سچا پریمی عام طور پر غریب مزدور کنگال ہی تو ہے۔ وہ تو چراچر میں اسی کا جلوہ دیکھتا

ہے اُسے ہر جگہ نری نظر آتا ہے۔ وہ بھی صرف اپنی محنت مشقت اور کام دھندوں سے جو نا اُن کو پلتے کا ہی واسطہ رکھتا ہے۔ دوسروں کے لئے کشٹ برداشت کرنا بھلائی اور دیس سیوا، ماتو تا کی عبادت کرنا ہی اپنا کرم دھرم سمجھتا ہے

اگر سچ پوچھو تو اِن سرمایہ داروں نے ایشور کو اپنی تجوری کا مال سمجھ کر ایک کھلونا بنا رکھا ہے۔ غریب پڑوسی معہ عیال بھوک کی آگ میں جل رہا ہے۔

اور یہ لذیذ کھانوں سے بے جان مورتیوں کو سیر کرا رہا ہے۔ کیا مخول بنا رکھا ہے ان الجھنوں نے میری رہی سہی عقل کا دیوالہ نکال دیا میری سمجھ نے جواب دے دیا۔ "جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے" خیال نے پھر قلابازی لگائی میں کتنا ناستک ہو گیا ہوں۔ پرم پیارے بزرگوں کے بنائے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر گمراہ ہو رہا ہوں۔ اس بارے میں ایسا سوچنا بھی پاپ ہے۔ تو نرک کا بھاگی ہوگا۔ من کی کمزوری سے میں تھر تھر کانپنے لگا۔ نہیں ... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی نہ کوئی راز سربستہ ہے۔ کیا ہمارے رشی منی و عالم بزرگ ان باتوں کو نہ سمجھتے تھے؟ کیا وہ ایسے انجان تھے؟ حقا کہ ہیں

اس خیال نے میرے دل کی دھڑکن کو کچھ کم کیا اور سوچنے کا موقعہ مل گیا۔ سوچتے سوچتے آخر یہی سوچ پایا۔ کہ مندر و شوالے وغیرہ بنانے کا شائد یہ مطلب ہو کہ ان اداروں میں لوگ تعلیم حاصل کریں۔

اناتھوں، اپاہجوں، یتیموں کی پرورش ہو اور تعمیری کاموں میں اصلاح ہو یا گئو رکھشا جو کہ ہندو دھرم کا موکش انگ ہے۔ پالن اور نسل سدھار ہو۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر ایک مندر میں گئوشالہ اور پاٹھ شالہ بنوائی گئی ہے۔ اگر ہمارے بزرگوں کی یہ منشا تھی۔ تو اس سے بہتر اور کوئی ثواب کا کام نہیں ہو سکتا۔

افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑتا ہے۔ آج تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ آج کا مندر شوالہ لیسے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ کہ ایشور ہی جانتا ہے۔ تمام جہان کے بھنگڑی گنجڑی ان اداروں کے کرتا دھرتا ہیں ان ہی کرتا دھرتاؤں کی بدولت یہ ادارے بدنام ہو رہے ہیں یہ لوگ ان قومی خزانوں کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھے ہوئے ہیں قوم اور ملک جائے بھاڑ میں ان مفت خوروں کو اپنی عیش و عشرت اور جلوے مانڈے کی فکر ہے۔ گئو جاتی کا نشان مٹ جائے انہیں کیا؟ یتیم غریبوں کے درکھٹ کھٹائیں، ان ناتھوں گریوں، مہنتوں مٹھا دھاریوں کے رنگ میں بھنگ نہیں پڑنا چاہیئے۔ اگر کسی نے خدا لگتی کہہ دی۔ تو یہ آگ بگولہ ہو گئے۔ ناستک۔ بے دھرمی جو کچھ بھی منہ میں آیا۔ بک دیا۔ کہاں تک لکھوں۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لیسے مندر موجود ہیں جن کی آمدنی لاکھوں کروڑوں تک ہے ماسوائے

چند افراد کے قوم اور ملک کو مجموعی طور پر رتی بھر فائدہ نہیں بلکہ انجان اور سیدھے سادے مزدور کو بھگوان کے نام پر بدھو بنا کر لوٹا جا رہا ہے۔ اس حالت میں ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ نہ دیو کاریہ نہ پتر کاریہ۔

اگر کوئی فائدہ ہے تو ایسے مفت خور، خیالی سورگ، نرک کا لالچ اور ڈر دینے والوں چور کپٹ ناتھوں کو۔

ہمارے تیرتھ استھان:-

اسی طرح ہمارے تیرتھ استھان ہیں جن کا ماسوائے نقصان کے ملک کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہے مجھے ریاست کے باہر ہردوار، کاشی دوار کا وغیرہ کے تیرتھوں میں جانے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ اس لئے ان جگہوں کا مجھے کچھ بھی تجربہ نہیں۔ کیوں کہ میں وہاں تک گیا ہی نہیں۔ عام طور پر سنا جاتا ہے۔ کہ وہاں بھی ہمارے دھرم پر لگائے گئے سرمایہ سے وہاں کے مفت خورے پنڈا لوگ جائز و ناجائز ہر طرح سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو یہ تیرتھ تیرتھ بھی بڑی حد تک ہماری ترقی میں روڑا اٹکانے کے موجب ہیں۔ میں بیان کر رہا تھا۔ کہ مجھے باہر کے تیرتھوں کا بہت کم تجربہ ہے البتہ ہماری ریاست میں شری اشٹو دیوی کٹڑہ کا بڑا مشہور تیرتھ استھان ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں ہر سال یاترا آتے اور لاکھوں روپے کا چڑھاوا بھی چڑھتا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں حرام خور پرورش بھی پاتے ہیں۔

ایک دو بار مجھے یہاں جانا پڑا۔

ایک بار تو تب گیا جب میں ابھی بچہ ہی تھا۔ اس وقت میری حالت بڑی عجیب تھی۔ قدم قدم پر سنبھل سنبھل کر چلنا تھا۔ اور ایک ایسا ڈر دامنگیر تھا۔ کہ میری ناجائز حرکت سے دیوی ماں کے درشن دینے سے انکار ہو جائے۔ کیوں کہ وہاں کے پنڈا لوگ و دیگر کٹر پنتھ ودواسی اسی قسم کی من گھڑت کہانیاں سنا سنا کر سادہ لوح انسانوں کو دیوی ماں کا سچا وشواسی بنا دیتے تھے۔ دوسری بار گیا جب میں تمام نشیب و فراز کو بخوبی سمجھ سوچ سکتا تھا۔ صرف اسی وقت کے کچھ حالات قلمبند کرتے ہیں۔

جموں سے گاڑی میں روانہ ہو کر تقریباً دو گھنٹہ بعد کٹڑہ پہونچ گیا یہاں میری رشتہ داری بھی ہے۔ میں انہی کے گھر جا کر ٹھہرا۔ بوقت شام ایک دوست میرے پاس آیا اور کہنے لگا چلو پنڈت جی تھوڑی دور سیر کر آئیں۔ میں نے کہا یار کہاں کی سیر کروانے ہو۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر گھونٹ کو نگلتے ہوئے کہا۔ کہ آج آپ کو شری جگنا تھ پوری کو درشن کروا لاتے ہیں۔ میں نے بھی پاپوش پہنا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ ابھی ہم بیاس قدم بھی نہ چلے ہوں گے کہ میرا ہمراہی ایک مکان میں داخل ہوا۔ اور مجھے بھی اندر آنے کے لیے اشارہ کیا۔ اندر داخل ہو کر جو کچھ وہاں دیکھا میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی باقاعدہ ایک اچھے پیمانہ پر مے خانہ نظر آیا۔ دس پندرہ آدمی بیٹھے جام پر جام انڈیل رہے تھے۔ مانس کی پلیٹیں سجی تھیں۔ یعنی وہاں نہ

تمام سامان موجود تھا جو ایک بڑھیا قسم کی بار یا ریسٹورینٹ میں موجود ہونا چاہیے۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا یار تم کہاں سے یہاں لے آئے ہو کیا یہی جگناتھ پوری ہے۔ اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ہاں! ہاں یہی جگن ناتھ پوری ہے اگر کل یہاں سے ہٹے تو شری بدری کے آشرم کے بھی درشن ہو جائیں گے۔ اس سے خانہ بدری پور پر جگناتھ برہمن ہے۔ اسے جگناتھ پوری کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو بدری ناتھ برہمن سے اُسے ہم بدری کا آشرم سے موسوم کرتے ہیں۔

میرا دوست تو شراب پینے کا عادی تھا۔ اور کبھی کبھی میں بھی شوق کیا کرتا تھا۔ اپنی عادت پوری کر کے ہم دونوں ڈیرے پر واپس آئے دوسرے دن صبح ماتا کے درشن کے واسطے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کٹڑہ سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دل ہی دل میں خیال آیا کہ زمانہ کس اور جا رہا ہے اور ہم لوگ ... میں نے پر خاموشی کو توڑتے ہوئے اپنے دوست سے پوچھا! بھائی کیا یہ سب خانے سرکاری طور پر کھلے ہیں۔ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا کہ آ ... وھ ... کواری ... آدھ ... فرلانگ ... رہ گئی ہے ... وہاں ہاتھ ہلاتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چڑھائی چڑھنے لگا۔ سانس میرا بھی پھول گیا تھا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ اور خیالوں کی دنیا میں کھو گیا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں بھی چڑھائی چڑھنے لگا۔

ادھر کواری تقریباً ۲ ۱/۲ ہزار فٹ کی بلندی پر بہت سندر مقام ہے میرے دوست نے اپنی جھنڈی ایک طرف جمائی۔ اور جھٹ جیب سے چلم اور چرس نکالتے ہوئے بولا۔ بم بھولے، لگے دم مٹے غم، کمائے دنیا کھائے ہم۔ ایک دو منٹ میں دھوئیں کے گولے چلنے شروع ہو گئے۔ چلم سے لاٹ نکال کر دھوئیں کا غبارہ منہ سے نکالتے ہوئے بولا۔ ہاں! اب کہو کیا بات ہے۔ اب میں ہر بات کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں ۔۔۔ تو آپ نے پوچھا تھا کہ یہ ٹھیکے سرکاری طور پر کھلے ہیں۔

تو شریمان پنڈت جی مہاراج! اس نگری میں کسی کا ٹھیکہ ٹھاکا نہیں۔ یہاں تو دیوی ماں کی کرپا سے سب کا اپنا اپنا ٹھیکہ ہے۔ دوکاندار یاترا کے دنوں پیاز و تھوم دوکان پر نہیں رکھتے۔ تاکہ یاترو سمجھیں کہ یہاں کے سب لوگ ویشنو ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو گھر سے منگوا کر اور چھپا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ماس بیچنے والا بھی ہر دوکاندار سے پوچھ لیتا ہے۔ کیوں پنڈت جی پرساد نہیں لو گے۔ اگر کسی کی مرضی ہوتی ہے تو خفیہ بولی سے آدھ گز یعنی آدھ سیر کہہ دیا۔ تو وہ سب کے گھروں جنہوں نے کہا ہوتا ہے دے آتا ہے۔

اگر یہاں کے لوگ مندرجہ بالا چیزوں کے لین دین میں چوری کی عادات رکھتے ہیں۔ تو ناجائز شراب کی چوری بھی چوری نہیں کہلاتی اس کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ تو امرت ہے۔ اور سمجھا جاتا ہے۔ تب ہی تو

دیوی ماں کے چرنوں میں بسنے والے پچیس فیصد بھگت شراب گنگ منبع ہیں۔ چرس کے خمار میں اس نے جھومتے ہوئے کہا شراب ... یہاں جیسی شراب فروخت ہوتی ہے۔ سب ناجائز طور پر ہی ہوتی ہے۔ اِس جگناتھ پوری اور بدریکا آشرم کے علاوہ بہت سے مقام ہیں جہاں شراب بکتی ہے۔ اِن سب میں زیادہ کام اِن دونوں کا ہی ہے اِن دونوں جگہوں پر تیس تیس بوتل شراب روزانہ فروخت ہوتی ہے۔ یاترا کے دنوں میں تو کام اور بھی تیزی پر ہو جاتا ہے۔ اِس پہاڑی و دیگر نواح کی پہاڑیوں پر رہنے والے ٹھکر اور دوسرے لوگ تقریباً یہی کام کرتے ہیں۔ کنستروں کے کنستر اِن مقاموں پر پہنچا دیتے ہیں۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ میں نے کہا بھائی اس طرح کھلے بندوں ناجائز شراب کے باوجود تیرتھ استھان ہونے کے یوں بھی سخت ممانعت ہے۔ سرکار کی طرف سے اِس ناجائز فروخت کو کوئی نہیں روکتا۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ منع کون کرے گا؟ یہاں سرکار کی طرف سے چند پولیس کنسٹیبل اور آنیسر چوکی مامور ہیں۔ ان کی لاہ رسم بندھی ہوئی ہے۔ ہر ایک بیچنے والا کنسٹبل کو آٹھ آنے یومیہ اور اگر شوق کرنے والا ہو۔ تو شراب بھی نوش کروا دیتا ہے۔ اِن دونوں کا کام چالو رہتا ہے۔ سرکار جائے بھاڑ میں، یہی گپ شپ لگاتے ہوئے تقریباً شام ہونے سے پہلے ماتا کے دربار گئے۔ میرا ساتھی بھی عجیب کھوپڑی کا مالک تھا۔ وہ اپنا شغل کئے بغیر کہاں چین لینے والا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے شراب

وہاں بھی دستیاب ہو گئی۔

شغل پورا کرنے کے بعد وہ تو اپنا حصہ لینے کے لئے چلا گیا اور میں الجھنوں کی اُدھیڑ بن میں لگ گیا۔

میرا دوست بھی اِس چڑھاوے کا حق دار تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد مستی میں جھومتا ہوا اور کچھ بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ کیوں پنڈت جی آپ ابھی تک یوں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔

ارے ادھر آ کونڈوے کے نیچے لا ادھر... لال... پری اور جھٹ انڈیل دی گلاس میں

لو! پنڈت جی ... پیئو... اور جیو۔

خیر ختم ہوا معاملہ جو بوتل میں تھا۔

میں نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تو پنڈت جی آپ کو کھتا مال بن جاتا ہے۔ خاک بنے گا مال۔ سارے شریک بہت ہیں ہیں۔ گھر دن پر ہماری باری کی رقم یا چڑھاوا تقسیم ہوئی ہے۔ مزا ہے اُن ٹھکروں کو جن کی ایک ایک کی باری ہوتی ہے کم از کم ۲۰ یا ۳۰ ہزار روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے مگر حرام کا مال حرام میں جاتا ہے۔ وہ چار ماہ کے اندر اندر یہ روپیہ جوا، شراب اور بدفعلی میں ختم ہو جاتا ہے۔

اِن واقعات کے تحریر کرنے کا یہی مطلب ہے کہ اب ہمارے تیرتھ استھان اور تیرتھوں پر رہنے والے لوگ کدھر جا رہے ہیں مِل جُل کر جو چڑھاوا نقد و سونا چاندی وغیرہ ہم لوگ چڑھاتے ہیں۔ وہ تقریباً

انہی نیک کاموں میں خرچ ہو رہا ہے۔

کچھ چور کو مور جیسے اشخاص چڑھاوے سے پہلے ہی ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ غرض کہ جیب کترے، اٹھائی گیر، چور، اُچکے، ان ہی ستھانوں پر گزارہ کر رہے ہیں۔ اور ان مندرجہ بالا اشخاصوں کی خواہشوں کو پورا کرنے والی شراب کی بھٹیاں دن بہ دن بڑھ رہی ہیں۔ خماری میں ہڈی کو چوسنے کا لطف بے زبان پشوؤں کا دھڑا دھڑ قتل عام ہو رہا ہے اور پیٹ کی بھوک مٹ گئی۔ مگر . . . .

ہوس کی بھوک . . . .

کسی بھی طریقہ سے پورا کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ اور ہوس کی بھوک جی بھر کے مٹا لیتے ہیں۔ اور مٹا رہے ہیں۔ کسی کی بھوک کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی بھوک مٹانے والے جانور انہی جگہوں پر زیادہ تر اپنے اڈے رکھتے ہیں۔ صبح اٹھا سیر کرنے چل دیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے دماغ کو معطر کیا۔ آنکھوں نے اونچے اونچے پہاڑوں کا نظارہ کیا۔ ے مگر دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے (غالب) ٹھنڈی اور ہلکی ہلکی ہوا میں میرا دل گھبرا گیا۔ ماں کے چہروں میں راکشش نظر آئے۔ پاپ گنگا شو کھ گئی، شراب گنگ بہہ نکلی میں اس میں بہہ گیا۔ میرا سارا ملک بہہ گیا۔ جدھر جاتی ہے آگ لگاتی ہے۔ مگر مجھے چین نہ ملا۔ میرا دل متواتر گھبراتا رہا جھٹ دیر گاڑی میں نہ بیٹھ گیا۔ جموں پہنچنے پر میں نے ایک مضمون ایک ہندو اخبار کو برائے اشاعت دیا۔ جس کا عنوان تھا۔ کہ وشنو دیوی میں کیا

دیکھا۔ وہاں دیوی وغیرہ تو روپوش تھیں البتہ بھیڑ بیر کا راج تسلط ہو ہوا ہے وغیرہ وغیرہ ....

لیکن اُس ہندو اخبار کے ایڈیٹر نے اس مضمون کو شائع نہ کیا کیوں کہ ایسے واقعات سے ہندو تیرتھوں اور ہندوؤں کی بدنامی ہوتی ہے۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ کبھی خیال آتا کہ یہ وہی پہاڑی ہے جہاں سے چند روز یا سال پہلے دودھ کے مٹکے آیا کرتے تھے۔ اور آج شراب خانہ خراب ہم کتنے اندھ وشواسی ہیں۔ لاکھوں روپے دان کی صورت میں تیرتھوں وغیرہ پر خرچ کرتے آئے ہیں لیکن کبھی غور نہیں کرتے آیا کہ اس سرمایہ سے فائدہ ہو رہا ہے۔ یا نقصان۔

خیر ان باتوں کو یہیں خیر باد کیا جائے۔ بہتر ہے۔ اصل مضمون تو دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ان تیرتھوں وغیرہ میں جانے پر بھی جانے پر بھی میری بے چینی میں اور پریشانی میں کچھ زیادتی ہی ہوتی گئی ہیں۔ پھر وہی گہری سوچ وچار کہ جتنا روپیہ درگا کے نام پر یا تر و چڑھاوے کی صورت میں صرف کرتے ہیں۔ اگر اُس سے آدھی رقم بھی تعمیری پروگراموں پر خرچ ہوتی تو یہاں کے لوگ مالا مال ہو جاتے یہ دان اور چڑھاوے کا پیسہ ماسوائے بے کاری اور بدکاری پھیلانے کے اور کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے خیال میں اگر ملکی اور قومی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر اگر مذہبی مفاد یعنی گئو رکھشا، اُس کی نسل سدھار پر ہی صرف

ہو۔ تو بھی بڑا فائدہ ہو سکتا ہے لیکن جو کچھ اس دان کے پرتاپ سے اس
علاقہ میں بے کاری اور حرام خوری و دیگر خرابیاں پھیلی ہیں۔ خدا کی پناہ
دن بدن مہامایا کے ارد گرد کے دیہاتوں کی آج وہ دردشا ہو گئی ہے
قابل رحم ہے۔ جہاں کہ لوگ صرف تین ماہ یاترو میں لوٹ کھسوٹ کا
کام کر کے ۹ ماہ بیکار پڑے رہتے ہیں۔ یاترو تو دروازے سے
شری وشنو دیوی کے گن گان کرتے آتے ہیں لیکن یہاں کے
لوگ ناجائز آمدنی کی وجہ سے شری مان بھیرو جی کے بھگت بنے
جا رہے ہیں۔ نیز ان جھگڑوں سے میرا کیا واسطہ میرے آتے
سے جھگڑے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ میں تو دل کی شانتی کی
تلاش میں یہاں کچھ امید نظر آتی ہے ٹکریں مارتا پھرتا ہوں۔ لیکن
ہوں قسمت کا پٹیا۔ اُلٹا لینے کے دینے پڑتے ہیں۔ جوں جوں
علاج کیا مرض بڑھتا گیا۔ دانی کے دربار سے بھی خالی ہاتھ آیا اب
کیا کیا جائے۔ اسی سوچ میں ڈوبا تھا۔ کہ خیال آگیا۔ نوراتروں کے
دن تھے یہاں رام ناٹک کی تیاری ہو رہی تھی۔ میرے چند دوست
کلب میں کام کرتے تھے۔ انہیں کی وساطت سے میں بھی کلب میں
داخل ہو گیا تو اب کا ثواب اور دل لگی کی کئی طرح کے سوانگ بھرے
یہاں کے حالات تفصیل میں قلمبند کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کاموں
پر بھی جتنا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے سب کا سب بے فائدے
جاتا ہے۔ یا کلب کے چند ایک ممبر یا کمیٹی کے کرتا دھرتا فائدہ

اٹھا لیتے ہیں۔ غرض کہ خود غرضی جو کہ ہندو قوم کی لا دو مرض ہے یہاں بھی ان سے نے پیچھا نہ چھوڑا۔ میں نے اُن حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کئی بار اپنے ساتھیوں اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے اِلتجا کی کہ ہر سال آپ بھگوان رام کے سوانگ بھر بھر کر نچواتے اور ہر سال ہی تماشہ شہر والوں کو دکھاتے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آپ ان دنوں یہی چندہ کا سرمایہ لگا کر رامائن، مہابھارت، گوروگرنتھ گیتا، آدی کے دوہے، چوپائیاں، شلوک وغیرہ کے پمفلٹ مختلف زبانوں میں چھپوا کر اور دیہاتوں میں جا کر اپنے دُکھی کسان بھائیوں میں اپنے ہندو دھرم کا پرچار کریں جیسے عیسائی دھرم کے ماننے والے بڑے دنوں میں اسی دھرم کا پرچار کرتے دیکھے گئے ہیں۔ یا یہ کھیل تماشے دیہاتوں میں جا کر ایک ایک دن ایک ایک جگہ کئے جائیں۔ لیکن طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سنتا ہے سچ ہے غریب ہونا بھی ایک پاپ ہے۔ اگر غریب آدمی ایک اچھی سے اچھی بات بھی کہے تو بھی اس کو جوتے ہی پڑتے ہیں یہی حال میرا ہے۔

میرے وہی تین کلنے گئے تھے دل بہلانے
اچھا دل بہلا مفت کی سردردی مول لی۔ اسے کہتے ہیں قسمت کا

بنائی کھیر ہو گیا دلیا۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کدھر جاؤں

کیا کروں، آج تک یہاں کہیں بھی جھک ماری اٹھا ہی پھل ہلا۔ اپنی الجھنوں
میں پھنسا ہوا تھا۔ کہ انہیں دنوں جموں میں کیرتن کا بڑا زور شور تھا۔
باہر سے ایک مہاتما آئے ہوئے تھے میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن
کا خیال کیا تھا۔ اچھا تھا یا برا۔ ہاں ڈھولک باجہ کھڑ تال اور کئی طرح
کے ساج باجوں کے ساتھ رام بھجو اور کرشن بھجو کی امرت بانی سے
ہری نام کی ورشا ہو رہی تھی۔ استریاں، پُرش، مرد، بالک، سبھی ساج
اور سنتور کی تاریں جھوم رہے تھے مجھے بھی ایسی چیز کی تلاش تھی
جتنی دیر یہ کیرتن ہوتا رہا میں بھی شامل ہوتا رہا۔ کچھ دن تو خوب پریم
برستا رہا۔ آخر وہی ڈھاک کے تین پات۔ کیرتن کے اندرونی رُخ
نے میری سچائی کا دیوالہ نکال دیا۔ آنکھوں سے آنکھیں لڑ رہی ہیں اور
کیرتن بھی ہو رہا ہے۔ دل نے کہا ارے مورکھ تو یہاں کیا ڈھونڈنے
آیا ہے جیسے تو ڈھونڈھتا ہے۔ وہ کبھی ڈھونڈنے سے نہیں ملا۔

دل نے کہا . . . . .

وہ تو ہر جگہ موجود ہے اور یہ لوگ اس کی تلاش میں یہاں نہیں
آئے۔ انہوں نے اپنے دل کا چین و قرار ڈھونڈھ کر ساتھ رکھا
ہوا ہے۔ یہ لوگ گھر سے ہی جوڑے بن کر آتے ہیں۔ تمہیں ان
کی برائی بھلائی سے کیا واسطہ، ان باتوں کو یہیں ختم کرنا مناسب ہے
البتہ مجھے کیرتن کا طریقہ عبادت پسند آیا دل میں خیال پیدا ہوا کہ بجائے
باہر مارا مارا پھرنے سے اپنے گھر میں بیٹھ کر کیرتن کر لیا کروں۔

زیادہ نہ سہی گھڑی دو گھڑی بھر ہی دل بہلانا ہو جایا کرے گا۔ اس لئے میں گوپال کرشن کی مورتی اور دیگر مورتیاں مسیح صاحب اور گورو نانک کی مورتیاں اپنے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں جس کو ہم ٹھاکر دوارہ کہا کرتے ہیں استھاپن کر کے روزانہ صبح و شام کھڑتال اور ایک تارا کی مدد سے کیرتن اور ناچنا شروع کر دیا ایسا کرنے سے دل بھی لگنا شروع ہو گیا۔ کچھ دنوں اس پرانے مرض دیے چینی سے چھٹکارا رہا لیکن یہ بھی ایک عارضی شغل تھا۔ دراصل اپنا سنا یہ بھی ناہیں ہے۔ یہ بھی ایک بہلاوے کی چیز ہے ایسا کرنے سے بھی دیس اور جاتی کو کوئی فائدہ نہیں میرا وہی پرانا مرض بے چینی . . . . جاگ اٹھا۔ نئی تلاش شروع ہو گئی۔ اتفاق کی بات سمجھو یا اعمال یا کیرتن کا پرتاپ۔ گؤشالہ کی ایک گاؤشالہ کا منیجر بنا دیا گیا۔ اور میں دراصل کوئی ایسا ہی پروگرام چاہتا تھا کہ جس سے اپنا من بھی چین پائے۔ اور جاتی کا بھی کلیان ہو۔ یہ میرا ایک خیالی پلاؤ ہی رہا۔ اس گؤشالہ کا نام نھا مہا نیر دل گؤشالہ جس وقت مجھے اس گاؤشالہ کا چارج ملا تھا۔ وہاں نہ چارہ نہ دانہ صرف بیس راس گاؤ ہی پشو صرور تھے۔ چارج ملتے ہی کئی طرح کی خیالی سکیمیں دماغ میں دوڑنا شروع ہو گئیں۔ کہ اس گاؤشالہ کو ڈیری فارم میں تبدیل کر دوں گا اور دودھ کی ندیاں بہا دوں گا جس سے میرے دیس کے سوکھے

منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ چند دنوں میں ہی
معلوم ہو گیا کہ یہ گاؤ شالہ بھی ایک بکھیڑا ہی ہے۔ اوپر ذکر کیا گیا ہے
کہ گاؤ شالہ میں ماسوائے بیس راس پشوؤں کے ایشور کا نام ہی
نہ تھا۔ نہ چارہ، نہ دانہ، نہ پیسہ ناظرین سوچتے ہوں گے۔ کہ ایسی
گاؤ شالہ میں جانور کیا کھاتے ہوں گے۔ کھاتا کیا تھا.....
بھوک کے مارے جانور جن میں بچھڑے بچھڑیاں بوڑھے بیل
اور بیمار گائیں تھیں۔ دیکھنے والے کو ترس آئے بغیر نہ رہتا تھا بے
منہ سے بیساختہ نکل جایا کرتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہ یہ بھوک سے
تڑپ تڑپ کر مرنے والے جانور اُن جلادوں سے ہی نہ
بچائے جاتے۔

بھوک سے مرنا سب موتوں سے بری موت ہوتی ہے
اس طرح ترس ترس کر مرنے کی بجائے جلاد کے ایک وار سے
ہی ختم ہو جاتے کتنا بہتر تھا۔ یہ گاؤ شالہ تو بوچڑ خانے سے بھی
بدتر ہے۔ میں نے کئی بار وہاں کے کرتا دھرتوں سے ان تمام
واقعات سے آگاہ کیا۔ لیکن اُن کے کان پر جوں تک نہ رینگی
تمام واقعات تفصیل وار تحریر کرنا اصل مضمون کو طوالت دینا ہے صرف
اتنا تحریر کر دینا واجب ہے۔ کہ گاؤ شالہ دراصل کیسے بنی تھی۔ یہ
شالہ بھی چند ایک خود غرض ہندو نوجوانوں نے ایک قسم کا
روزگار بنا رکھا تھا۔ تمام لوگ جانتے [illegible] اس ہندو [illegible] میں گائیں

مال ذبح کرنے کی ممانعت ہے۔ اس لئے پنجاب کے دانی سیٹھ عام طور پر جنہیں بھائی بہت سا مال بیوپاریوں سے کار ثواب سمجھتے ہوئے خرید کر اسی ریاست میں بھیج دیتے ہیں۔ اس وقت یہی ہی حال تھا۔ جتنے جانور علاقہ انگریزی سے ریاست میں داخل ہوتے ابھی جماعت یعنی مہابیر دل کے ذریعہ ہی دوسرے لوگوں میں بانٹے جاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس گاؤشالہ سے پشو حاصل کرنے کے لئے دان دکھشنا کی صورت میں کچھ نہ کچھ رقم مقرر تھی۔ اور طریقہ کار اسی طرح جاری تھا۔ کہ جتنے پشو گاؤشالہ میں داخل کئے جاتے۔ آدھے مقرری لے کر خواہش مند اصحاب کو دئے جاتے گاؤشالہ کا دراصل ذریعہ آمدن دراصل یہی تھا۔ یوں تو دو نوکر رکھے ہوئے تھے۔ جو صندوقچیاں لے کر بھیک مانگ لایا کرتے تھے پشوؤں کو دیتے اور بھیک کی آمدنی سے تھوڑا بہت چارا دانہ چل جاتا۔ کچھ نوکروں کی تنخواہ بن جاتی۔ اور بچا کھچا آپس میں کارکن جائے پائی کی صورت میں تقسیم کر لیتے صاف بیانی تو یہ ہے کہ زیادہ تر تعداد جانوروں کی وہاں ہی پہنچ جاتی۔ جہاں سے وہ چھڑائے گئے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بیوپاری لوگ ریاستی زمینداروں کا بھیس بنا کر گھات لگانے جانوروں کے پیچھے ہی چلے آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ کام فائدے کا ہوتا۔ اول تو وہ جانور جو انہوں نے ہی دانی اور کار ثواب کے دلدادوں کے ہاتھوں پچاس یا ساٹھ روپے میں فروخت

کیا ہوتا۔ انہیں بڑی آسانی سے دو چار روپے میں دان دکھشنا دیگر حاصل ہو جاتا ہے۔ انہیں جب بندہ منیجر تھا۔ ایک ایسا واقعہ درپیش آیا تحریر کرتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ واقعہ یوں ہے چودہ راس گائیں چند ایک ہندو نوجوانوں نے جو کہ اس دل کے ممبر تھے دیدہ دانستہ یا اتفاقیہ طور پر بوچڑوں کے پاس مبلغ -/۵۵ روپے میں فروخت کر دیں۔ یہ مال یہ لالہ بیلی رام گوپال داس جینی نے سیالکوٹ سے بھیجا ہوا تھا۔ بوچڑ دوبارہ اسی مال کو سیالکوٹ لے گئے۔ دانی سجنوں نے مال شناخت کر لیا۔ بیچانے والوں کو شک گذرا کہ ہو نہ ہو یہ مال

انہوں نے پولیس میں رپورٹ درج کروا کر بوچڑوں کو معہ مال مسروقہ گرفتار کروا دیا۔ بوچڑوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر اصل رسید مبلغ -/۵۵ روپے جو ان نوجوانوں سے بوقت خرید حاصل کی تھی پیش کر دی۔

قصہ کوتاہ اصلی ملزم جنہوں نے گائیں بوچڑوں کو فروخت کی تھیں عدالت منصف صاحب جموں سے ان پر مقدمہ چلا۔ ممکن تھا کہ یہ لوگ سزا پا جاتے لیکن ہندو سماج کے کرتاؤں نے اس معاملہ پر خاک ہی ڈالنا بہتر سمجھی۔ اور تمام کاروائی کچھ سبھا کی مہربانی سے اور کچھ پولیس کی مہربانی سے رفع دفع کر دی گئی۔ اس واقعہ نے میرے دل پر بہت برا اثر کیا۔ کیا یہی ہماری گاؤ بھگتی ہے کیا یہی ہمارا ہندو پن

ہے اس واقعہ سے مجھے کچھ لابھ بھی ہوا۔ اور پتہ چل گیا کہ جس طریقے سے آج ہندو جاتی گاؤ جاتی کی رکھشا کرنی چاہتی ہے۔ یہ طریقہ کار چند ایک لولی لنگڑی اور بیمار گائیں رکھ کر ایک گاؤ شالہ قائم کرنا ہے وقت اور سرمایہ دونوں کی بربادی کرنی ہے۔ تو اس سے تو یہ ہی بہتر ہے کہ عمدہ نسل کی گائیں رکھ کر ہندو جنتا کو دودھ مکھن وغیرہ بہم کیا جائے۔ اور اسی آمدنی سے جانور بھی پالے جائیں۔ کار کا کار اور ثواب کا ثواب اس خیال کو میں نے کئی بار ہندو سماج کے روبرو پیش کیا۔ کہ اگر تمہیں گاؤ ماتا سے اتنا ہی پیار ہے تو اُن کو بیوپار کے طریقے یعنی گوجروں کی طرح پالو تبھی گاؤ رکھشا کا سوال حل ہو سکے گا۔ لیکن :-

ہندو! ایشور کو بھی من مرضی کا کھلونا سمجھنے والے مجھے پاگل سمجھنے لگے اور کئی تو مجھے برا بھلا کہہ کر کہنے لگے۔ کہ ہم اونچی ذات کے برہمن کھشتری گوالوں کا نیچ کام کریں۔

کتنے افسوس کا مقام ہے گوپال سادھو کا پجاری ہو۔ و گوپالن جیسے اُتم کام کو نیچ سمجھتا ہے۔ بس میں تھا اور میرا خیال، بغیر سرمایہ میرے تمام ارادے ریت کی دیوار کی طرح مسمار ہو گئے۔

مقدمہ کی تحقیقات

اس سے پہلے چودہ راس گائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مبلغ ۵۵ روپے

میں دل کے ایک ممبر نے بوچڑوں کے ہاتھ فروخت کی تھیں اس لئے
میں اس پر مقدمہ چلا اس مقدمہ کی پوچھ تاچھ کے سلسلہ میں بحیثیت منیجر
ہمراہ پولیس و دیگر کارکنان گاؤشالہ برائے شناخت چمڑا مردہ بیل مجھے
سیالکوٹ جانا پڑا۔ وہ تمام حالات بتانا اشد ضروری ہیں۔ کیونکہ ان جانوروں
میں سے چند ایک نر و مادہ بوچڑوں نے پولیس کے چھاپے سے
پہلے ہی ذبح کر دئے ہوئے تھے۔ پہلے دن تو اُن کے یعنی بوچڑوں
کے گھر سے باہر ہی چمڑے کی شناخت کر والی گئی۔ لیکن دوسرے دن
میں اکیلا ان کے گھر پہونچا اس راز کو جاننے کے لئے میرے دل
میں اک آگ کا طوفان اُٹھ رہا تھا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے
کو کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی چلے آؤ: وہاں ایک عمر رسیدہ بوچڑ بیٹھا
ہوا حقہ پی رہا تھا میں نے جاتے ہی سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیتے
ہوئے بڑے مودبانہ لہجہ میں مجھے بیٹھنے کو کہا میں کرسی پر جو وہاں
موجود تھی۔ بیٹھ گیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ بوڑھے میاں سے گذارش
کی بڑے میاں جو کچھ عرض کروں یا دریافت کرنا چاہوں سچ سچ بتانا
آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس نے جوابا کہا کہ والئے چمڑا کے بارہ میں
نہیں آپ کے دھندا کے بارے میں
بوڑھا حیران ہوگیا میں اس کے چہرے سے اتار چڑھاؤ کو تاڑ
گیا۔ اور اپنے مقصد کو پھر دہرایا۔ کہ آپ کا یہ کام کیسے چلتا ہے۔ اول
دودھ کے سب سے سستا ملتا ہے کیسے اور کہاں سے دستیاب ہوتا

ہے اور کن کن طریقہ کار سے مال حاصل کرتے ہو۔ اور اس پوچڑ گری کا کام چلانے میں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے درا صل سوال کرنے میں میری یہ غرض تھی کہ یہ لوگ ریاست سے مویشی کیسے نکال لاتے ہیں جب کہ حکومت وقت کی طرف سے گاؤ ماں کی نکاسی کے لئے اتنی سخت پابندی عائد ہے۔ کہ اگر ایسا فعل کرتا ہوا کوئی پکڑا جائے اور جرم ثابت ہو جائے تو نہ جانے تین سال سے کم جیل کی ہوا کھائے بغیر خلاصی ہونا مشکل ہے

بڑھے میاں نے حقہ کو گڑگڑاتے ہوئے کہا بابو جی اشا پکھ پوچھ کر تم کیا کرو گے بے کار وقت گنوانا ہے اگر کچھ پوچھنا ہی چاہتے ہو۔ تو ایک شرط پوری کرنی ہوگی۔ میں نے کہا وہ کون سی ایسی شرط ہے آپ بتائیں اگر پوری کرنے والی ہوگی تو ضرور پوری کر دوں گا۔

اس نے کہا۔ بھائی آپ نہ جانے ریاست کے کوئی سرکاری آدمی ہوں اور ہمارے تمام راز ریاست سے گاؤ ماں کی نکاسی کے آپ مہاراج کو سنا دو گے۔ تو ہمارا یہ کام دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔

یہ بات سن کر مجھے اتنی ہنسی آئی کہ ملے منہ سے کے بات نہ کر سکا بمشکل ہنسی کو روکا اور دل ہی دل میں کہا کہ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو اتیلی۔

میں نے کہا بھائی ہمارے مہاراج بہادر، کوئی چھوٹے موٹے
مہاراج نہیں ہیں جو ہم جیسے بھیک منگوں کی باتیں سنتے رہیں۔ وہ تو
[illegible] مہاراج، ادھیراج، راج راجیشور اور سرکار انگریزی سے کئی
طرح کے خطابات کے، سی، ڈی، ای، وغیرہ حاصل کئے ہوئے
ہیں۔ وہ تو جس کی آمدنی پانچصد روپے ماہوار سے کم ہو، بات تو
بات درشن تک بھی نہیں دیتے۔ تم ذرا فکر نہ کرو۔ یہ شرط تو خود بخود
پوری ہوئی جانو۔ اور آپ نے جو کچھ بتانا ہے بلا دریغ بتاؤ۔

بوڑھے نے خاص انداز سے لال لال مہندی رنگی داڑھی
پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بھائی جیسے جو کام کرنا پڑتا ہے اس کے
نشیب و فراز کو دیکھنا پڑتا ہے ہمارا دھندا بھی بڑا عجیب و غریب
ہے ہمیں ملٹری کو بہت سپلائی کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تہاں سے جیسے تیسے
مال ملے لانا پڑتا ہے۔

یہ دان سے چلنے والے آپ ہندو لوگوں کے گاؤ شالے
نہیں ہیں۔ مفت کے پیسے اور مفت ہی جائیں۔

بوڑھے کی اس قسم کی گفتگو سے اندازہ لگایا۔ کہ بوڑھا میاں
تمام واقعات بتانے سے احتراز کر رہا ہے۔ کیونکہ اس وقت
گؤ شالوں کا ذکر بے موقعہ ہے اس لئے میں نے کہا مجھے تمام
باتیں پوچھنے سے کوئی خاص مطلب بھی نہیں ہے۔ یوں ہی شوقیہ
دریافت کر رہا ہوں۔ اگر بتانا نہیں چاہتے تو چلا جاتا ہوں۔ میں اٹھ

کر چلنے کو تیار ہی تھا۔ کہ بوڑھے میاں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور
بابو آپ کیوں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیا ناراض ہو گئے
میں نے جواباً کہا۔ میاں میں تو آپ کے بیوپار کے سلسلہ
پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ آپ نے ہمارے دھرم کے اداروں
بارے میں ادھر ادھر کی کہنی شروع کر دی۔ بھلا میاں گاؤشالہ
ذکر کی کونسی ضرورت آپڑی تھی۔ بوڑھا کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اپنی
ناند کو کھجاتے ہوئے بولا۔ آپ ہندو ہیں آجتک آپ لوگوں
ہمارے مقابلہ میں نام تہاد جس میں نہ دانہ اور نہ چارہ بھیک اور
پر چلنے والے گاؤشالے کھڑے کر کے اس مفید جانور کو لاکھوں
بلکہ کروڑوں روپے خرچ کر کے بچانے میں کوئی کسر باقی رکھی چھوڑ
ہے۔ میں سچ کہنے کا عادی ہوں سچ بات تو یہ ہے کہ اس
آدھا سرمایہ کہیں صحیح معنوں میں بیوپار کے طریقے پر خرچ ہوتا
ہمارے بوچڑ گری کے دھندے کا کب سے دیوالہ نکل جاتا
اپنے گریبان میں منہ ڈالیں آپ بھی تو اسی قسم کی گاؤشالہ کے
ہیں آپ نے تجربہ کیا ہوگا۔ کہ بیوپار چلانے کی خاطر جائز و ناجائز
طریقہ اور قرض لے کر بھی اپنا کاروبار چلانا ہی پڑتا ہے۔ لیکن آپ
کے گاؤشالے چند ایک لولے لنگڑے اور بیمار جانور جس سے
کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ رکھ کر اس مفید جانور کو مارنے
رہ جاتے ہیں۔ ہاں جوش میں آکر کچھ سرمایہ دار کچھ روپیہ پیسے اور

چلانے کی خاطر دان کر دیتے ہیں جب تک یہ سرمایہ امداد کرتا رہتا
ہے کام چلتا رہتا ہے اور بعد میں چوپٹ اس لئے دان کا پیسہ
بیوپار پر لگے ہوئے سرمایہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دان کا پیسہ جوہڑ
کی طرح ختم ہو جاتا ہے اور بیوپار پر لگا ہوا سرمایہ چشمے کے پانی کی
طرح ابلتا ہوا اپنی ترقی آپ کرتا چلا جاتا ہے یہ ایک کھلا ہوا راز ہے
کہ جو چیز اپنی امداد یا اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی وہ بے شک مردہ
ہے ایسے ہی گاؤ شالوں پر لگا ہوا سرمایہ مفت کا ہوتا۔ اور مفت میں
ہی ناکارے جانوروں کی پرورش کرنے میں ختم ہو جاتا ہے موجودہ
طریقے پر چلنے والے گاؤ شالے فضول نہیں تو اور کیا ہے آپ
سمجھدار ہیں۔ ذرا سوچیں تو آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا۔ جب یہ
دان کے سرمایہ سے چلنے والے گاؤ شالے چالو ہوتے ہیں اور
بہت سے ہیں ان اداروں سے آج تک آپ کی قوم اور اس مفید
جانور کو کہاں تک فائدہ ہوا ہے۔ میرا مطلب کہ کتنا دودھ مکھن
گھی اور پنیر وغیرہ بازار میں روزانہ آکر فروخت ہوتا ہے اور گائے
کی نسل کا کیا سدھار ہوا ہے۔ بس وہی چند ایک لولی لنگڑی اور ناکارہ
گائیں جن کو ویٹرنری ڈاکٹر بھی ذبح کرنے کے واسطے پاس نہیں کرتا وہی
جانور ایسی گاؤ شالاؤں کی زینت بڑھاتے ہیں۔ اس لئے میں نے
گاؤ شالاؤں کا ذکر کیا تھا۔ اور آپ نے سمجھ لیا کہ میں بیان۔ توجہ کر
آپ کے دھرم کے کاموں میں دخل دے رہا ہوں۔ شاید آپ

اسی وجہ سے ناراض ہو گئے تھے اور جو کچھ آپ دریافت کرنا چاہتے ہیں بتانے سے گریز کر رہا ہوں میں اس کا جواب سنکر کچھ شرمندہ ہو گیا۔ کیوں کہ جو کچھ اس نے کہا بالکل سچ تھا۔ اور سولہ آنے سچ اگر ہندو صحیح طریقے پر گوجروں جیسا کام کرتے تو کوئی مشکل کام نہ تھا کہ گئو ماں کا سنکٹ دور ہو جاتا لیکن یہ ہندو جاتی جو کام کرتی ہے سب تماشی۔ میں نے بوڑھے میاں سے کہا کہ اس جھگڑے کو یہیں ختم کرو۔ اور اصل بات کرو۔ بوڑھے نے حقہ کا کش کھینچتے ہوئے کہا یا بو باتیں کہنے میں بہت وقت لگے گا۔ اگر سننا ہی چاہتے ہو تو دل لگا کر سنو۔ میں گیا ہی اسی کام کے واسطے تھا۔ بھلا دل لگا کر کیوں نہ سنتا

بیوپار کا بیان

بوڑھے نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا کیا آپ نے ہی پوچھا تھا کہ ہمارا دھندا کیسے چلتا ہے بھائی جیسے دوسرے قصاب پہاڑوں یا دیگر جگہوں سے بھیڑ بکری وغیرہ شہروں میں لا کر آپ لوگوں کو مہیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی یہاں سے نفع مند سودا ملتا ہے وہیں سے مال خرید لاتے ہیں۔ پنجاب کے ہندو یا مسلمان زمینداروں سے ہمیں بہت کم مال دستیاب ہوتا ہے البتہ شہروں سے دودھ سوکھے پشو تمام کے تمام نہیں تو آدھے سے زیادہ ہمارے ہی ہاتھ لگتے ہیں۔ یا زیادہ سستا اور فائدہ مند

سودا آپ کے پروہتوں اور ڈگونتوں سے ملتا ہے۔ میں پروہتوں اور ڈگونتوں کا نام سُنکر حیران و شرمندہ ہو گیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ بھلا یہ ہندو اپنے پشوؤں کے ہاتھ کیوں کر بیچ دیتے ہیں

بیچ دیتے ہیں کیوں کر انہیں بھی تو دان میں مفت پشو مل جاتے ہیں۔ 'مالِ مفت دلِ بے رحم'

میری حیرانی کو توڑتے ہوئے بوڑھے نے اپنا بیان پھر شروع کر دیا۔ آپ حیران کیوں ہو گئے۔ کیا پروہتوں اور ڈگونتوں کا نام سُنکر۔ شاید تم بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو ذرا غور سے سنو ہم کئی طرح کے ڈھنگ کھیل کر اپنے ایجنٹوں کی معرفت جو کئی طرح کے بھیس بنا کر کوئی زمیندار نہ کوئی اور کوئی سادھو کا سا بن کر شہروں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں وہی مال خریدتے ہیں۔ آپ شاید پروہتوں اور ڈگونتوں کا نام سُنکر حیران ہوئے تھے۔ کہ یہ لوگ ہمارے پاس اپنا مال کیوں کر بیچ دیتے ہیں۔ بھائی ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اگر ہم ہتھکنڈوں سے کام نہ لیں تو اپنا کاروبار کیسے چلے۔

میں نے ٹوکتے ہوئے سوال کیا کہ آپ دھوکا دے کر ہی اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔

مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے دھیمی آواز میں یوں مخاطب ہوا۔

نہیں . . . نہیں۔ ایسا ہے بھی اور نہیں بھی۔

انہی چالاکیوں کی ضمانت پہ ہم دوسروں کو بھی پھنسا لیتے ہیں

اس کی گفتگو کو رد کرتے ہوئے میں نے کہا بزرگوار کیا آپ من گھڑت
کہانی تو نہیں سنا رہے۔

واہ : واہ ہندو ہو کر آپ کے ہاتھ اپنے گاؤں پشو کو فروخت
کر سکتے ہے بوڑھا مسکراتا ہوا کہنے لگا بابو ایسا مت خیال کرو ہمارا روز
کا دھندا ہے آپ کے کہنے پر ہی تو صحیح حالات بتا رہا ہوں آپ
بخوبی جانتے ہیں اکثر ہندو گئو کے دان کو بڑا متبرک دان تصور
کرتے ہیں۔ اور کوئی ایسا موقعہ نہیں۔ مثلاً تیرتھ یاترا کے بعد بوقت کریہ
کرم آدھ برسی، برسی، چھ برسی اور برتوں کے موقعوں پر ہی تمہارے
داتی لوگ رسم کو پورا کرنے کی خاطر نکمے اور خورد سالہ بچھڑیاں
پروہتوں، ڈکھنتوں اور اچارجیوں کو کار ثواب جان کر دان کر دیتے
ہیں۔ اور ایسا دان کرتے وقت اس کے ساتھ کچھ پارچات اور برتن
و نقدی کی صورت میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہی لوگ لالچ میں
آ کر دان اٹھا لیتے ہیں جانور کو خوراک چاہیے۔ وہ لوگ ایسے نکمے
جانوروں کی پرورش نہیں کر سکتے لاچار ہو کر فروخت کر دیتے ہیں۔

ایک بات اور بھی ہے کہ یہ دان خور عام طور پر بھنگڑی
گنجڑی اور افیمچی زیادہ ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی کوئی وقت کی رفتار
کے ساتھ ساتھ شراب پینے کا بھی عادی ہو گیا ہے۔ اپنے اخراجات
پورے کریں یا سوکھے سڑے جانوروں کی پرورش کریں بعض دفعہ

خاطر دس یا بارہ روپے میں ہی ہمارے ایجنٹوں کے پاس جو ای
سات میں لگے رہتے ہیں۔ فروخت کر دیتے ہیں اور ہمارے ایجنٹ
مال دیہاتوں میں جمع کرتے رہتے ہیں۔ جب کافی تعداد میں یہ مال
اکٹھا ہو جاتا ہے۔ تو ہمارا آدمی جسے ہم ہیرو کہتے ہیں تمام مال دیہاتوں
سے ایک جگہ اکٹھا کر لیتا ہے وہی مال ہم سلسلہ وار حسب ضرورت شہر میں
منگوا لیتے ہیں۔ کئی دفعہ ہمارے آدمیوں کو یہ کام یعنی ایک جگہ سے
دوسری جگہ مال راتوں رات کرنا پڑتا ہے سچ پوچھو تو جتنا خرچ
ہے اس سے آدھے پشو ہم کی ریاست سے یہاں اتنی سخت
بندی ہے خرید کر لاتے ہیں۔

خدا ہی جانتا ہے بڑی جیان جوکھم کا کام ہے۔

اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچنے لگا۔
یہ بوڑھا کہیں بھنگ تو نہیں پی بیٹھا آخر مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے
کہا۔ ارے میاں ذرا ہوش کی دوا کھاؤ۔ بھلا جس ریاست سے گائے
یا بیل کے نکاس پر حکومت وقت کی طرف سے اتنی کڑی پابندی
عائد اور ایسا جرم کرنے والے کے لئے ایسا قانون عائد ہو اور
اگر ایسا کرتا ہوا پکڑا جائے تو سات سال کے لئے جیل میں ٹھونس دیا
جاتا ہے۔ بوڑھے نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ
ٹھیک ہے بابو جی جو کچھ آپ فرماتے ہیں صحیح ہے لیکن ہم ہزاروں

اپنی بوڑھے ... نے حقہ کا کش کھینچتے ہوئے پھر شروع کر دیا۔
سُنو بھائی! ہم نے باہمارے ایجنٹوں نے حدود بندی کیا س
پر رہنے والے ریاستی زمینداروں، ذیلداروں اور جمبرداروں سے
اچھی طرح میل جول پیدا کر لیا ہوتا ہے۔ دُور دور سے مال خرید کر
لوگوں کے پاس اکٹھا کرتے رہتے ہیں وہاں سے آہستہ آہ
جیسا موقعہ ملتا جاتا ہے۔ مال حدود ریاست سے علاقہ انگریز
میں لے آتے ہیں میں نے پھر سوال کیا کہ اتنی بڑی چوری اور
بے خبر۔ بابوجی آپ بھولے تو ہیں ہی میرا خیال ہے کہ آپ اچ
بھی ہیں۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے ذیلدار، نمبردار، چوکید
مالدار۔ اور پٹرول کا پیادہ یہ سب ہمسے سب باخبر ہوتے ہیں۔ ا
سب اچھی طرح جانتے ہیں، ان ہرے شاہی سکوں میں بڑی
کرامات ہوتی ہے۔ یہاں کسی طرح یا سفارش وغیرہ سے کام
نہ چل سکے وہاں ان کی جھنکار سب کچھ جائز ناجائز کروا دیتی
ہم بیوپاری ہیں، ہمیں ہر قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے جد
وقت بن پڑے سمجھانا پڑتا ہے۔ منت سماجت سے جید
تبھی ہو اپنا کام چالو رکھنے کے لئے کرنا ہی پڑتا ہے کئی بار نو کا
رقم صرف کر کے جان خلاصی کروانی پڑتی ہے۔ بھائی صاحب! ک
کہوں بڑی چوکسی کرنی پڑتی ہے۔ تب ہی تو آج تک کام چل ر
ہے۔ اور مال کی بھی کمی نہیں آتی۔ تقریباً ایک ہزار پونڈ بیف روزا

ملٹری کو سپلائی کرتے ہیں اور اسی مقدار میں دیگر لوگ بھی خریدتے ہیں
اکثر کام چل رہا ہے اور ہمارا بھی گذارہ ہو رہا ہے

بوڑھے نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا بھلا یہ
پہاڑی گائیں اور کام بھی کیا آسکتی ہیں۔ جو دن رات میں ایک سیر یا
تین پاؤ سے زیادہ دودھ ہی نہیں دیتیں۔ نہیں وہ گائیں تمہارے ہی
ساہوکاروں کی بدولت بڑے سستے داموں مل جاتی ہیں۔ وہ اس
طرح کہ شاہوکار اپنی غریب آسامیوں سے لین دین کے سلسلہ یا
جیسے تیسے اچھے بڑے پشو قرضہ کی ادائیگی میں لے لیتے
ہیں۔ وہی پشو فروخت در فروخت ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں سچ
پوچھو تو انہیں جانوروں کی بہترین طریقے سے اچھا دانہ وچارہ نسل
سدھار کرکے اس کو اس قابل دودھارو بنانے کا بندوبست ہوتا کہ
یہ پشو کم از کم پانچ چھ سیر روزانہ دودھ دے سکتے۔ بوجہ زمیندار بھی مفرور
نہ رہتا تو کیا مجال تھی جو ہم لوگ ان بے زبانوں کا بال بھی کابھی کرسکتے
اس طرف آپ لوگوں کا تو دھیان ہی نہیں گیا۔ بلکہ بابو جی آپ لوگ
گائے کو صرف نمائشی طور پر دیوتا سمجھتے ہو۔ لیکن اس کی صحیح معنوں
میں پرورش کرکے اُسے دودھارو بنانے سے غافل ہو اگر تم
ایسا کرتے تو ہم لوگ نکمے ہاتھ پر ہاتھ دھرے مکھیاں مارتے
نظر آتے مگر اسی پہاڑی مال سے ہمارا کام جاری رہا ہے۔ اگر پنجابی
مال پر کاروبار چلانا پڑتا تو ہماری ضمانتیں کب کی ضبط ہو جاتیں میں

اس کی تمام باتیں ٹکٹکی باندھے غور سے سنتا رہا اِس بیچ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا بوڑھے نے بیان کیا ہے کہ آپ کی پہاڑی گائیں اور کام ہی کیا آ سکتی ہیں۔ کسی حد تک درست ہی کہا ہے۔ سال ۱۹۸۶ یا ۱۹۸۷ بکرمی تھا۔ ان دنوں میری ڈیوٹی کٹھوعہ میں تھی۔ مالخانہ یعنی پھاٹک سرکاری سے تو اس پچھڑیاں بچھڑے اور گائیں صرف دس یا گیارہ روپے میں نیلام ہوتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ فی راس ایک روپیہ دو آنے قیمت ہوئی۔ بھلا جس گائے کی قیمت بکری سے بھی چار یا پانچ گنا کم ہو وہ اور کیا کام آ سکتی ہے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ یہ بوڑھا بھی بلا کا آدمی ہے کیسے پتے کی باتیں کر رہا ہے۔ مجھے ایک بات اُس وقت بڑے پتے کی سوجھی میں نے سوال کیا اے بڑے میاں، یہ مال آپ حدود ریاست میں کن کن جگہوں سے باسانی نکال لاتے ہو۔ بوڑھے نے اپنا گنجا ناخود والا سر کھجلاتے ہوئے نیچی نکھارتے ہوئے کہنا شروع کیا آپ تو اس طرح سوال کئے جا رہے ہیں جیسے وکیل ملزم پر عدالت میں جرح کرتا ہے کہیں ہم پر مقدمہ تو نہیں چلانا چاہتے۔ میں نے ہنستے ہوئے اور یقین دلاتے ہوئے کہا۔ بابا آپ ایسا خیال دل میں مت پیدا کریں میں تو یونہی شوقیہ دریافت کر رہا ہوں کیوں کہ مجھے آپ کی باتیں سن سن کر اپنی جانی پر بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ مزہ بھی۔ بوڑھے نے کہا آپ شوقیہ ایسا کر رہے ہیں تو

میں نے شغلیہ ایسا کہہ دیا۔ دونوں ہنس پڑے اُس کے چہرے
پر ہزاروں جھریاں اُبھر آئیں اور ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ اللہ قسم
جہاں تک مجھے معلوم ہے سے لے کر منگلا مائی تک جتنی حدود
ریاست علاقہ انگریزی کے نزدیک ہے ہم مال نکال لاتے ہیں
کئی پر کئی جگہوں پر تو حد بندی آپس میں اس قسم کی ملی جلی ہوتی ہیں کہ ریاست
کا مال انگریزی علاقہ اور انگریزی علاقہ کا مال ریاست میں چرتا پھرتا
ہے۔ اب صرف یہی پتا نا باقی رہ جاتا ہے۔ کہ کہاں کا مال کہاں
پہونچتا ہے سو جی کٹھوعہ کے علاقہ کا مال تیجا پور، ہیرانگر اور سانبہ
کا مال چک امرو سے نارووال وغیرہ میں ارنیہ سے لے کر بڑھیال
برہمناں کا مال سیالکوٹ، ہیرپور سدھر، مناور اور بھمبر کا مال گجرات
اور دریائے جہلم کے پار یعنی کا مال جہلم اور راولپنڈی
میں پہنچ جاتا ہے اور کس کس جگہ کا نام لوں یہ سب کچھ سن کر میں
نے ایک سوال اور کہہ دیا میاں آپ نے کہیں ذکر کیا ہے کہ
ناقابل ذبح جانور ہی گئو شالاؤں میں پہونچتے ہیں۔ بھلا اس پر بھی
کچھ روشنی ڈالئے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

بوڑھے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بابو! ان
بکھیڑوں کو سن کر کیا کروگے۔ ان میں کیا رکھا ہے اگر سننا ہی چاہتے
ہو تو بہ خوشی سنو ہم تو ایسا کرتے ہیں جب ڈاکٹر ناقابل ذبح بیمار بوڑھے
جانور نکال دیتا ہے وہ بھی کبھی کبھی وقت ہی اکثر ان لوگوں سے بھی

ہماری راہ و رسم بندھی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی قانونی رسم و لحاظ کو پورا کرنے کی غرض سے ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ بس یہ ہی نکمے اور بیمار نا قابل ذبح جانور جب کچھ تعداد میں ہمارے پاس جمع ہو جاتے ہیں انہیں نکمے جانوروں کو ہانک کر جینی یا دوسرے ہندو بازاروں سے لے گذرتے ہیں انہیں گؤ بھگتی کا جوش آجاتا ہے خاص طور پر جینی بھائی بڑے رحم دل مانے ہوئے ہیں۔ ہمارا اُن کا سودا پک جاتا ہے۔ اور ایسے سودے میں ہم لوگ بہت فائدے میں رہتے ہیں۔ جہاں تک کہ جس جانور کو ذبح کر کے بمشکل تیس یا چالیس روپے حاصل نہیں ہوتے۔ اسی جانور کی قیمت ہم ان رحمدل ثواب کمانے والوں سے ساٹھ یا ستر روپے دوگنی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ اُن کے پاس بھی دان یا دھرماؤ کھاتے کے پیسے جمع ہوتے ہیں۔ بلا دریغ خرچ کر دیتے ہیں اب سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ ثواب کے دلدادہ ہماری کتنی امداد کرتے ہیں یعنی آپ لوگوں کا دان بھی کسی حد تک ہمارے ہی کام کے چلانے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا میاں اس کا یہی مطلب ہوا کہ تمہارا کام چالو رکھنے میں ہماری ہی جاتی تمہاری امداد کر رہی ہے بڈھے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا بابو جی! ایک نہیں ہر طرح سے ہم لوگوں کو آپ لوگوں کا

ہی سہارا ہے چمڑے کا کاروبار، سپورٹ کا دھندا، عام طور
ہندو سرمایہ داروں کے سرمایہ سے چالو ہیں اس کا مکمل حال بعد
میں بتاؤں گا۔ بلکہ ہم کو اپنا کام جاری رکھنے کیواسطے روپے ہندو
ساہوکاروں سے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ لالچ خور نیز
زیادہ سود کے لالچ میں ہمیں یہ خوشی قرض دے دیتے ہیں۔
بوڑھے نے میری حیرانی کو توڑتے ہوئے ایک عجیب قسم کا
قہقہہ لگاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ارے بابو تم بہت امید سے
سادھے آدمی ہو۔ بنا جان پہچان کے بھی کوئی قرض دیتا ہے
ہائے لالچ بہت بُری بلا ہے۔ یہاں تمہارے ہندوستان
میں کچھ سیٹھ ایسے سیٹھ ہیں ماتھے پر تلک لگاتے ہیں مندر
بنواتے سادھو سنتوں کی سیوا کرتے ہیں۔ اور بڑے دھرماتما
گنے جاتے ہیں۔ ان کا دھندا سن کر آپ کے پاؤں کے نیچے
سے مٹی نکل جائے۔ ان کا دھندا ہے گائے کی زبانوں کا بیوپار
امریکہ اور انگلینڈ و دیگر یورپی علاقے والے لوگ گائے کی زبان
کے شوربے کو پسند کرتے ہیں۔ اصل ذکر تو باقی ہے ہم تو بازار کی
شرح سے تقریباً ڈیڑھ گنا یا دو گنا سود ادا کرنا پڑتا ہے
میں اس کی باتیں سن کر دل ہی دل میں کچھ شرمندہ سا ہو رہا
تھا کیا ہم میں ایسے انسان بھی ہیں ہاتھی کے دانت دکھلانے کے اور
کھانے کے اور۔ پریشان ہو رہا تھا میرے چہرے پر پریشانیوں

کے تشکون کو تاڑتے ہوئے بوڑھے نے تمسخرانہ انداز سے پھر کہنا شروع کیا۔ ارے بابو کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔

روپے پیسے کمانے والے دھرامان چنداں پروہ نہیں کرتے انکو جیسے تیسے پیسے چاہئیں۔ ایمان دھرم جائے بھاڑ میں تمہارے بڑے بڑے دھوتی پوشوں نے ملٹری میں سرمایہ داروں کی خوشی سے بیت سیلائی کے ٹھیکہ جات لے رکھے ہیں اور بوٹوں کے کارخانے 75% ہندو ساہوکاروں کی بدولت ہی تو چل رہے ہیں اس کے علاوہ سیورٹ، بناسپتی گھی کے کارخانے بھی تو انہیں لوگوں کے بل بوتے کے محتاج ہیں۔ میں نے مزید دریافت کیا۔ سپورٹ، چمڑے کا دھندا تو ہوا بھلا بناسپتی گھی سے اس جانور کو کیا نقصان پہنچتا ہے بوڑھے نے جواب دیا کہ یہ گھی بھی اس جانور کا ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ مجھے زیادہ تو معلوم نہیں لیکن جہاں اس نیل نما گھی کے کارخانے جاری ہوتے ہیں وہاں سے ہمیں مال کافی سستا مل جاتا ہے ابھی ہیرا پھیری میں وہاں جانا پڑتا ہے کیونکہ یہ گھی مونگ پھلی اور بنولا کے تیلوں کو سوڈا کاسٹک یا ایک اور دیات کے برادہ کے ذریعہ سے صاف کر کے کچھ چربی وغیرہ کی آمیزش کر کے تیار کیا جاتا ہے۔ بعد میں مصنوعی گھی کی خوشبو دے دی جاتی ہے اصلی گھی کی نسبت بہت ارزاں پڑتا ہے اس لئے وہاں اصلی گھی تیار کرنے

والی مشینوں ہشو دھن کی ضرورت نہیں رہتی۔ اب تو آپ بخوبی جان
گئے ہوں گے۔ زیادہ طول دینا فضول ہے۔ اب آپ کو کچھ کروم
اور تندی کے بارے میں بتانا ہے۔ آپ امیر لوگ کروم اور
کاف لیدر پہننا بہت پسند کرتے ہیں جس طرح یہ کروم اور کاف
لیدر تیار ہوتے ہیں۔ اگر ان کی بناوٹ کا طریقہ سنو گے تو اور بھی حیران
ہو جاؤ گے۔ اسی طرح عمدہ قسم کے رنگیڈوں میں تندی استعمال
ہوتی ہے۔ اسی تندی سے بنے ہوئے ریکٹ آپ رئیس زادوں
راجہ مہاراجوں کے ہاتھوں میں شوبھا پاتے ہیں۔ جانتے ہو یہ تندی
کیسے تیار ہوتی ہے۔ اس کی تیاری کا ڈھنگ بڑا ہی نرالا ہے۔ ہمارے
جیسے بے رحموں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں دو یا تین سال
کا بچھڑا یا بچھڑی جس کی پرورش اچھے طریقے سے ہوئی ہوا سے
خوب کھلا پلا کر اس کے نتھنے اور منہ کو سی دیا جاتا ہے اس عمل سے
اس کا پیٹ تنگی تنفس سے پھول کر کپا ہو جاتا ہے تب اسے مار
دیا جاتا ہے یا جانور خود بخود دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے
آنتیں زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں۔ اور یہ ایک کھلا ہوا راز ہے ڈاکٹر
لوگ بخوبی جانتے ہیں۔ کہ جس حصہ جسم میں زیادہ تکلیف ہو وہاں دوران
خون زیادہ ہوتا ہے۔ وہی خون آنتوں میں جمع ہو کر آنتوں کو زیادہ
مضبوط بنا دیتا ہے اگر اب بھی اس قسم کی تندی کی بناوٹ آپ کو نہ
سمجھ آئی ہو تو تمہیں کروم لیدر کی بناوٹ کی مثال دے کر سمجھاتا ہوں

وہ اس طرح ہے۔ کروم چمڑا تیار کرنے کے واسطے عمدہ جانور کی کھال میں سوزش پیدا کی جاتی ہے پہلے پشو کو باندھ کر اس کا چمڑا ہنٹروں سے کوٹا جاتا ہے۔ مگر اب یہ کام مشینوں سے لیا جاتا ہے ایک ایک انچ زندہ جانور کا عضو ہنٹروں کی مار سے سوج جاتا ہے غرض کہ تمام بدن ضربات سے سوج جاتا ہے۔ اور اسی قدرتی اصول کے مطابق خون ضرب آلودہ جلد کی نچلی سطح پر کافی مقدار میں جمع ہو کر چمڑے کی اندرونی سطح کو خانے دار اور لچکدار بنا دیتا ہے جب یہ عمل پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے جانور کو ذبح کر دیا جاتا ہے۔ خون یہاں جمع ہوا ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد وہیں سرد پڑ کر منجمد ہو جاتا ہے یہی طریقہ کروم لیدر کے تیار کرنے کا ہے۔ اور متذکرہ طریقہ سے تندی تیار ہوتی ہے۔ یہی تندی عمدہ قسم کے ریکوں کی قیمت بڑھانے کا موجب ہوتی ہے۔

بھائی صاحب! دیکھئے بیوپار کے تحت گندے پیسہ کمانے کی خاطر انسان کتنا بے رحمی کا کام کرتا ہے جیسی مارکیٹ کی مانگ ہو پوری کرنی پڑتی ہے۔ اب تو زندہ گائے سے مری ہوئی گائے زیادہ قیمت پاتی ہے۔ جب تک ہماری زندگی سے زندہ گائے کا تعلق رہا۔ تب تک گائے جاتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا پر جب ہمارے روزانہ ضروریات میں اپنے آپ مری ہوئی گائے کی بجائے قصابوں دوارہ ماری ہوئی گائے کا چمڑا۔ چربی، خون اور

ہڈی کام میں آنے لگی ہے آجکل ان چیزوں کا انگریزی تہذیب
کی مہربانی سے بہت زیادہ شوق بڑھ گیا ہے۔ اس لیے زندہ
گائے سے مری ہوئی گائے کا زیادہ مول ہو گیا ہے اس کے
علاوہ جیسے میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ بناسپتی گھی، دودھ
پاؤڈر گھریلو دستکاریوں کے برباد ہونے اور افیون، چائے
تمباکو وغیرہ کی بڑھتی ہوئی کھیتی سے گائے چر بھومی کے رک جانے
ان چیزوں سے بھی گائے کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ پہلے
چمڑے کا اتنا زیادہ استعمال نہ تھا۔ لیکن اب تو چمڑا پاؤں سے
لے کر سر تک پہنچ گیا ہے۔ تہذیب اور جنٹلمین کہلانے والے
امیروں کا کوئی ایسا گھر نہ ہوگا۔ جہاں بلا ضرورت درجنوں جوتے
(بوٹ و سینڈل) سوٹکیس، اٹیچی کیس وغیرہ موجود نہ ہوں۔ موٹر
گاڑی کے گدے گھوڑا گاڑی کا سامان گھڑیوں میں باندھنے کے
فیتے ایسے ایسے سامان بنانے کی خاطر تقریباً 25,20000 کھالیں
اس ملک میں تیار ہوتی ہیں۔ صرف 1334400 کھالیں غیر ممالک
کو جاتی ہیں۔ باقی کی سب یہاں ہی کھپت ہو جاتی ہے۔ کھالوں کے
علاوہ ہڈی، کھاد اور کھانڈ صاف کرنے کے لیے، چربی کپڑے
میں مانڈی لگانے کے کام خشک شدہ خون چاہے کھیتوں میں کھاد
ڈالنے کے لیے سینگوں سے چاقو، چھریوں کے دستے بنائے
جاتے ہیں۔ کھروں سے سریش جیسے جیلاٹین بھی کہتے ہیں اسی

سرشیں سے کیپسول بنتے ہیں جنہیں کونین کو بے سود بنانے کی خاطر جو کہ بیماروں کو کھلائی جاتی ہے ان چیزوں کی مانگ دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ان کے علاوہ غیر ممالک کی گوسلوں کی مانگ نے تو اس بے زبان کا خاتمہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔اس بیوپار نے تو عمدہ سے عمدہ نسل و قیمتی گلئے کو بھی نقصان پہونچادیا جاتا ہے اچھی سے اچھی گائے کو بھی ذبح کر کے قصاب ہر حالت میں نفع مند رہتا ہے میں نے ایک طالب علم کی طرح اس کو استاد سمجھتے ہوئے کہا اُن باتوں کی سمجھ تو آگئی ہے۔لیکن یہ گوشلا کیا بلا ہے۔

بوڑھے نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا بابو جی یہ بلا جھلا کچھ بھی نہیں ہے۔یہ سب انگریزی راج و انگریزی تہذیب کے بیوپار کی کڑیاں ہیں کڑیاں کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ

یہ گوشے صحیح تعداد معلوم نہیں۔تقریباً اس قسم کی کھالیں غیر ممالک کو اور اتنی ہی اس ملک" سارے جہان سے اچھا ہندوستان میں خرچ ہوتی ہیں۔میں نے سنا ہے اور شاید آپ نے دیکھا بھی ہوگا کہ ہم لوگوں کے کوٹوں کے کالروں پر کچھ نرم نرم چیز لگی ہوتی ہے کہتے ہیں کہ یہ اسی قسم کا چمڑا ہوتا ہے اس کے علاوہ گوشلوں سے ٹوپیاں دستانے لیڈی بیگ اور دوسری قسم کی، نازک اندام گوری اور کالی میموں کے لئے چیزیں تیار ہوتی ہیں۔

میں پہلے ہی اتنا پریشان تھا۔کہ اور پریشان گن اور رونگھٹے

کھڑے کر دینے والے واقعات سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ اس تھوڑی سے وقفہ کی بے ہوشی نے میرے دماغ پر باپو کے اُن الفاظوں نے تسلط جما لیا جو وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

"کپڑے" جسم چھپانے کے لئے، سردی گرمی سے جسم کو بچانے کے لئے ہیں نہ کہ فیشن دکھانے کے لئے! آج تو ہر بات میں فیشن ہی فیشن ہے۔ میں نے ایسی بہت سی "ہنگی" باتیں دیکھی ہیں۔ اور یہ سوچ کر من میں دکھ ہوتا ہے کہ کیا ہماری تہذیبیا کا ناس ہی کریں گی۔

میرے دل اور دماغ پر چند لمحے گزرا ہوا اثر بوڑھے میاں کو بھی پتہ نہ چل سکا کیونکہ وہ خود داڑھی میں پھنسی ہوئی جوں کی تلاش میں تھا جو کہ اس کے دل میں سکون پیدا نہ کر رہی تھی اس لگن میں گم تھا۔ اور جھٹ میرے اس کی طرف دیکھنے پر بڑبڑایا ہاں تو میں کہہ رہا تھا بستا ہے گوشتوں کے بیوپاریوں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ یوں تو یہ گوشتے حاملہ بھیڑ بکری کو ذبح کر کے اس کے پیٹ کے بچے کے چمڑے سے بھی حاصل کرتے ہیں لیکن عمدہ قسم اور پائیدار و خوبصورت ۷ یا ۸ ماہ کی حاملہ گائے کو ذبح کر کے حاصل ہوتے ہیں۔ پہلے تو صرف انگو فرنگن ہی اس قسم کے کالروں والے کوٹ پہنا کرتی تھیں مگر آج کل تو آپ جیسے سیٹھ ساہوکاروں کی بہو بیٹیوں نے بھی ایسا کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور انہیں فرنگیوں کی طرح اپنا رہن سہن بنا لیا ہے اس

سے ئیے اس ملک میں گوشلوں کے چمڑے سے بنی ہوئی چیزوں کی مانگ کافی سے زیادہ ہوگئی ہے بابوجی ان کا بھی کیا قصور ہے جیسا فیشن ہوکرنا ہی پڑتا ہے باقی رہی کاف لیدر کی بات وہ بھی دو سالہ بچھڑے کے چمڑے کو کہتے ہیں ان چیزوں کے علاوہ ایک قسم کا رنگ حاصل کرنے کے لیئے بھی اس بے زبان پر ظلم ڈھایا جاتا ہے وہ اس طرح گذر سیتے لوگ ہیوری نام کا پیلا رنگ حاصل کرنے کے لئے گائے کو صرف آم کے پتے کھلانے کو دیتے ہیں۔ دوسری اور کوئی چیز نہیں دیتے۔ بلکہ پینے کو پانی تک نہیں پلاتے، بے چاری گائے بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجاتی ہے موجودہ مذکورہ بالا بیوپار اس جانور کے لیئے ازحد خطرناک ہے۔

نہ بوڑھے نہ جوان نہ بچھڑے نہ بچھڑیاں نہ دودھ والے نہ دودھ سوکھے اور نہ ہی گابن۔ ہر قسم کے جانوروں کو ذبح کر کے نفع کمایا جارہا ہے۔ اگر ان سب باتوں کو تفصیل وار بیان کرنے لگوں تو آپ اکتا جانے کے علاوہ کئی ہفتے سیالکوٹ میں رہو گے اب شام ہو رہی ہے آپ نے بھی کہیں ٹھہرنا نہ کرنا ہوگا۔ اس لئے آپ بھی تشریف لے جائیں اگر اور کوئی بات دریافت کرنی ہوگی تو کل پھر دس بجے کے بعد آجانا۔ میں بت بنا اس کی طرف دیکھتا رہا چپ چاپ اٹھا ابھی قدم نہ بڑھا تھا۔ کہ بوڑھے میاں پھر بول پڑے ابھی سورج غروب ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ ہے گاڑی تو سورج

غروب ہونے کے ایک گھنٹہ بعد آتی ہے جانے میں ابھی بہت دیر ہے ہاں ایک بات بطور یادداشت عرض کئے دیتا ہوں میں نے پہلے بھی اشارتاً کئی بار ذکر کیا ہے اگر ہندو لوگ اسے صحیح معنوں میں بچانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ تو وہ ایک ہی طریقہ ہے یعنی اقتصادی بیوپار کا طریقہ کافی سرمایہ لگا کر وسیع پیمانہ پر ڈیری فارمیں اور ڈرائی کیٹل فارمیں جاری کریں۔ زیادہ سے زیادہ دودھ دھارو بنانے کی خاطر نسل سدھار کے لیے ادارے بنائیں دودھ گھی مکھن پنیر وغیرہ کی پیداوار بڑھائیں۔ دیکھو بابو اب یہی پنجاب یا برطانوی ہندوستان ہے۔ اصلی گھی بھی یہاں نہیں ملتا پہلے تو کافی تعداد میں ملجاتا تھا۔ اب کیوں نہیں ملتا یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ گھی کے بنانے والے کافی تعداد میں مارے جا رہے ہیں۔ اس لئے ایسا ہوا ہے اگر آپ کی جاتی کے سرمایہ داروں کو سمجھ ہوتی تو وہ ہم جیسے مارنے والوں کا مقابلہ باآسانی کرسکتے تھے۔ آج یہی سرمایہ دار اپنا روپیہ چمڑا وغیرہ کے کارخانے بنانے پر صرف کر رہے ہیں۔ کیا وہ دودھ تیار کرنے والی ڈیری فارمیں نہیں بنا سکتے اس بزرگ کی باتیں سن کر خود اور اپنی گاؤ بھگت جاتی پر بہت رنج ہوا۔ دل و دماغ پریشان ہو اٹھا۔ آنکھوں سے آنسو کی خشک دھارا بہہ نکلی اور دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی مجھ سے رہا نہ گیا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ اور اپنی جاتی کو کوسنے لگا۔

بوڑھے نے کہا اچھا بابو! اب آپ نے . . .
"ہاں اب میں نے جانا ہے" دونوں ہنس پڑے نہ جانے
کیوں ؟
میں نے آخری سلام کیا اس نے بھی جوابی الوداع کہی۔
"ہاں اب میں نے جانا ہے" دل و دماغ پر چھا گیا۔ دل کو
سکون ملا اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسٹیشن پر پہنچا ساتھی انتظار
میں تھے گاڑی بھی تیار تھی۔ گورنمنٹ کے پہیے دستے سیٹی بجی۔ پھک
پھک پھک پھک۔ دو گھنٹے کے اندر جموں پہنچ گئے۔ جموں
پہنچنے کو تو پہنچ گئے مگر بوڑھے کی ملاقات میرے لئے ایک معمہ
بن گئی کبھی اس کی صداقت گوئی پر رشک آتا کبھی اپنی حیاتی یعنی
ہندوؤں کی نمائش گاؤ بھگتی پر رنج آتا
اس گاؤ شالہ میں بھری کیا ٹل تمام دنیا کی پریشانیوں کا پلندہ
ایک دم مجھ غریب کے سر پر دھر دیا۔ اس پر لے مرض کے
چھٹکارے کی خاطر در در مارا مارا پھرا۔ لیکن بدنصیبی بھی کوئی چیز
ہوتی ہے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

گاؤ رکھشا ایجی ٹیشن

میری پریشانی در گئو رکھشا کے کی دُر دُشا نے اور زیادہ
پریشان کر دیا۔ میری حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی گئی

اب اپنی بیماری پریشانی کا کیا علاج کروں۔ آج تک جتنے علاج کئے
سب کا الٹا ہی اثر ہوا۔ انہی دنوں جموں میں گاؤ ایجی ٹیشن کے نام
سے ہندو سکھ نوجوان سبھا کی طرف سے ایک تحریک جاری ہوئی
دل میں کچھ ڈھارس بندھی۔ کہ اب تو اس کرشن پیاری گائے کا
کچھ نہ کچھ بن کے ہی رہے گا۔ چھتیس دن کی ہڑتال نے تمام ہی
ہندوستان میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ جموں میں ہندوؤں نے تمام
کاروبار بند کر دیا۔ ہر طرف گاؤ ماتا کی جے کا فلک شگاف نعروں
سے آسمان گونج اٹھا۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، برہمن، کھشتری
ویش شودر غرض ہندو جاتی کا بچہ بچہ اس تحریک میں شامل ہو گیا
ہزاروں نوجوان گاؤ بھگت جیل میں ٹھونسے گئے۔ اس ایجی ٹیشن
کا مکمل حال تحریر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے حکومت کی طرف
سے عورتوں اور بچوں پر لاٹھی چارج لوگ بخوشی برداشت کر رہے
تھے۔ اتنی پرامن تحریک نہ آج تک کوئی چلی نہ چلے گی۔ گاؤ ماتا پر
ہندوؤں کی اتنی اٹل شردھا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی انگریزی
علاقے میں نہ سہی ہماری ریاست میں ضرور شنی جائے گی۔ اور
میری نسل سدھار ہو گا۔ آہا! اب تو ریاست بھر میں
چراگاہیں بنے گیں
دودھ کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ کئی طرح کے خیالی پلاؤ پکا پکا کر خوش
تھا۔ لیکن چند دنوں کے بعد کرشن کانت مالوی الاہ آباد کرنے کی
مہربانی سے ہیں جا کر ہڑتال کھلی۔ حکومت اور تحریک چلانیوالوں

میں سمجھوتہ ہو گیا تب جا کر معلوم ہوا کہ یہ بھی لیڈری کے دلدادہ خود غرض ہندوؤں نے کھیل ہی بنا رکھا تھا۔ میری خیالی خوشی، دائمی غمی میں جس کا مریض ہوں تبدیل ہو گئی اور خود غرض لوگوں نے گاؤ ماتا کے ٹکٹ پر اسمبلی کے چناؤ میں کسی نے اسمبلی کی ممبری حاصل کر لی کسی کو سرکاری ٹھیکیداری حاصل ہو گئی کسی کو لیڈری کی دم لگ گئی۔ غرض کہ تمام دہاد بے بندوں کے موٹے ہندو لیڈروں کی غرض پوری ہو گئی۔ اور جس کے نام پر اتنا کچھ ہوا اس کے لئے نہ چراگاہیں نہ چارہ نہ دانہ / نہ نسل سدہار۔ جس کے بل بوتے پر ممبری ٹھیکیداری اور لیڈری ہاتھ آئی۔ اس کو ماسوائے بازار سے ڈنڈے کھانے کے کچھ نہ ملا۔ ہاں کمیٹی نے آوارہ گرد جانوروں کے واسطے ایک پھاٹک ضرور بنوا دیا۔ اس اجی ٹیشن میں میرے انداز سے کے مطابق صوبے بھر کے ہندوؤں کا تقریباً ۴۰ یا ۵۰ لاکھ روپیہ برباد ہوا ہوگا اگر کوئی سمجھ دار لیڈر ہوتا تو اتنے روپے اور کچھ گورنمنٹ کی امداد حاصل کر کے گائے کے لئے کافی سے زیادہ بہتری کر سکتا تھا۔ آخر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ سوارتھ کے بندوں نے کام جاری کیا تو ان کا سوارتھ پورا ہو گیا۔

ناظرین کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ آجی ٹیشن کیوں جاری ہوئی اصل واقعات یوں ہیں کہ ریاست کا والی ہندو ہونے کے ناطہ سے ریاست میں دفعہ ۲۹۸ رنبیر ڈنڈ بدھی قانون کے تحت ریاست

جموں و کشمیر میں کوئی شخص گائے ذبح نہیں کر سکتا۔ اس دفعہ کے تحت ایسا جرم کرنے والے کو اگر ثابت ہو جائے تو سات سال یا جتنی اس دفعہ کی رو سے سزا ہوتی ہو دی جاتی ہے۔ لیکن نیچ فاضل جموں نے اس میں کچھ ترمیم کر کے ایسا فعل کرنے والے ملزم کو کچھ کم سزا رکھی۔ عام طور پر دوسری قسم کے جرم مثلاً قتل فوجداری وغیرہ میں بھی اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ عدالت اگر قصاص کی سزا ہوتی ہے تو اپیل کرنے پر سزا عمر قید میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کئی بار بری بھی ہو جاتے دیکھے گئے ہیں۔ اصل بناء فساد یہی دفعہ ۲۹۸ میں ترمیم ہی تھی تو بھی کیا ہوا۔ برطانوی ہندوستان میں تقریباً ستر ہزار کے لگ بھگ گائیں روزانہ ذبح ہوتی ہیں۔ وہاں نہ کسی کو سزا ہوتی ہے اور نہ ہی اس بات کے لئے کبھی کوئی ایجی ٹیشن ہی ہوئی۔ یہاں جو کچھ ہوا چند ایک من چلے خود غرض لیڈروں کے سجنوں نے عوام کے جذبات بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کر لیا۔ اور کچھ نہیں۔

دوران ایجی ٹیشن کئی قسم کے واقعات درپیش آئے لیکن ان میں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ ایک سچائی کی درگت دوسرا اگلے سے سلوک، ایک دن اس تحریک کے دوران میں بازار گیا ہڑتال تو تھی لیکن پھر بھی کافی رونق تھی۔ جلوس آتے "گوپیاں بلبھ رادھے شیام" "گاؤ ماتا کی جے ہو۔" دفعہ میں ترمیم کرنے والے ججوں کو نکال دو یا سزا دو۔ ایسا کرو۔ ایسا کے نعرے لگا ادھر سے ادھر

چلے جاتے بازار تو بند تھا۔ لیکن جا بجا شبیلے بیٹھے تھے۔ آنے جانے والے جلوسوں کو چھلکے ہوئے چنے کھانے کو دیتے اور ٹھنڈا پانی پینے کو "بڑے سواری لگدیئے چھوٹے جیالاں ڈے" کا گن گان کرتے۔ اس وقت ایک قسمت کی ہیٹی گائے جس کے نام پر اتنی قربانی ہو رہی تھی آ نکلی۔ آخر جانور جانور ہی ہوتا ہے اُس نے بھی شبیلے کی چنے والی ٹوکری میں منہ ڈالا ہی تھا کہ اتنے میں ایک والنٹیر جس نے گاؤ ماتا کے نشان والا جھنڈا اٹھا رکھا تھا آنکلا اُس نے آتے ہی اپنے جھنڈے والا ڈنڈا اس زور سے اُس کے تھوتھنے پر مارا کہ بے چاری کے ہوش بھول گئے۔ اور ایک دو ڈنڈے اُس کی پیٹھ پر اس بے رحمی سے رسید کئے کہ ماں کا پیٹ زمین سے سمٹ گیا۔ اور اُسے ایسا چکر آیا قریب تھا کہ وہ لڑکھڑا کے گر جائے لیکن تھی ذرا ہمت والی سنبھل گئی۔ کیوں کہ جموں شہر کی گائیوں کو ڈنڈے کھانے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ ان کی پرورش عموماً ڈنڈوں ہی سے ہوتی دیکھی گئی ہے۔ یہاں کچھ ایسا رواج ہے کہ دودھ دوہا اور بازار میں چھوڑ دیا۔ یہاں کے مویشی رکھنے والوں کے لئے عمدہ اور بہترین قسم کی چراہ گاہ بازار ہی تھے یہ بھوکے مویشی بھی کیا کریں کبھی اس دوکاندار کی بوری میں منہ ڈالا کبھی اس کی سبزی کی ٹوکری سے سبزی کھانے کی کوشش کی، ردی کاغذ چیتھڑے جو کچھ بھی ملا تمام بھوک مٹانے کی خاطر چبا لیا اور ساتھ

ہی ڈنڈوں کی مار اس گائے کے سمجھنے کی دراصل وجہ یہ ہی تھی۔ کیوں وہ بھی تو مار کھانے کی عادی ہو چکی ہے مجھے یہ نظارہ دیکھ کر اتنی ہنسی آئی کہ روکے نہ رک سکی۔ اور ساتھ ہی میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ عجیب طرح کی تحریک ہے جس کے نام پر یہ ستیہ گرہ جیسے اتنی قربانی کرتے ہیں۔ لاٹھی چارج ۲۴-۳۶ گھنٹے دھرنا اور وہ بھی ایک مری ہوئی گائے کے واسطے اگر اس کی ہی ایک جیتی جاگتی بہن نے ایک مٹھی بھر چنے کھانے چاہے تو اس کی یہ درگت اس پر ہی مثال صادق آتی ہے۔ کہ میرے ماں باپ کی شرادھ پر برہمنوں کو مالپوڑے اور کھیر اور جیتے جاگتوں کو دھکے یہی حال اس ایجی ٹیشن کا ہوا۔ بے شمار سرمایہ لاانتہا قربانی تمام ہندوستان کو حیران کرنے والی پرامن تحریک، اس کا یہ نتیجہ ہے چاری گائے کو کچھ بھی نہ ملا اس کے لیے نہ چراگاہوں کی مانگ نہ نسل سدھار کا مطالبہ اگر اس وقت حکومت سے اس مطلب کے واسطے مانگ کی جاتی تو حکومت بڑی خوشی سے ایسا کرنے کو تیار ہو جاتی اگر کچھ فائدہ ہوا تو انہیں لیڈری کے خواہشمندوں کو ان دنوں دیس سیوک سردار بدھ سنگھ جی نے ایک بیان دیا جس میں ان کا اصل منشا یہی تھا کہ ہندو مسلمان دونوں ملکر حکومت سے چراگاہوں کے لیے مشترکہ مطالبہ کریں اور مِل جُل کر گاؤ جاتی کی بہتری کی سبیل سوچیں لیکن سچائی کڑوی ہوتی ہے۔ اسے کوئی سچائی پسند ہی بے غرض قبول

کرتا ہے ہندی اور غرض کے بندوں کے لیے سچائی زہر قاتل ہوتی ہے ان بدھو ہندو لیڈروں نے اس بیان پر غور کرنا تو درکنار بری طرح ٹھکرا دیا۔ کیوں کہ اس میں ظاہراً طور پر ایک بات ایسی تھی جسے قبول کرنا ہندو جاتی کے لیے ناگوار تھی۔ انہوں نے اس بیان میں کچھ ایسا ذکر کیا ہوا تھا۔ کہ گاؤ بدھ نہ کرنے کا قانون تو ریاست میں نافذ ہے اس کی رو سے ریاستی مسلمان ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن ہندوستان کا مسلمان اگر اس کی گائے کسی قسم کی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس سے جانبر ہونے کی کوئی امید نہ ہو یا کسی پہاڑ وغیرہ سے گر کر بہت زخمی ہو جائے، کو حق ہے کہ اس کو ذبح کر کے اخراجات سے چھٹکارا حاصل کرے لیکن ریاستی مسلمان کو ایسی صورت میں بھی اس بیمار جانور کے اخراجات کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ حکومت اور ہندو جنتا کو چاہیئے کہ غریب مسلمان کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قسم کی چراگاہوں اور گاؤشالوں کا انتظام کریں کہ جن میں مسلمانوں کے ناقابل جانور رکھ کر پرورش کیے جا دیں۔

اسی طرح کے چند فقرے اس بیان میں درج تھے اس وقت جوش آئے ہندو لیڈروں کو ناگوار گزرے اگر اس قسم کا مطالبہ حکومت سے کیا جاتا تو ضرور منظور ہو جاتا۔ لیکن ایسا کرتا کون؟ جس کے دل میں ماں کے لیے سچی محبت ہوتی۔ وہاں تو تمام کے تمام لیڈری

کے خواہشمند اور سٹیجوں پر کھڑے ہو کر دھواں دھار الفاظی تقریریں جھاڑ کر بھولے بھالے شہری اور دیہاتیوں کو ورغلانے والے ہی تھے۔ گائے کے لیے سچا سادھن کون کرتا بھگوان گوپال کرشن کی پرم پیاری بھارت کی ماں کے واسطے کون چراگاہیں اور دیگر نسل سدھار کی باتیں کرتا۔ اِن مفت کے کرتا دھرتاؤں سے پنڈے کے لوٹے لیڈروں کو اپنی پڑی تھی۔ اس دھاندلی میں گائے کی کون سُنتا دہی ڈھاک کے تین پات والی بات بن گئی۔ آج تک بنی ہوئی ہے۔ گو پیاں دلبھ رادھے شام کے نعروں میں مندروں کی دیواریں گونج رہی ہیں۔ اور لوگ گووردھن اشٹمی پر سوکھی سڑی دُبلی پتلی گائیں جو اکثر یہاں کے مندروں کے باہر یا اندر کھڑی رہتی ہیں، ہار پہنا کر، ٹیکا لگا کر، پیڑا کھلا کر، پاؤں کو چھو کر جنم سپھل کر رہے ہیں۔

شروع سے لے کر جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے مندر تیرتھ استھان، گوشالہ، گاؤ ایجی ٹیشن اِن سب واقعات کے تحریر کرنے کی صرف یہی منشا تھی۔ کہ ہم جان جائیں جس راستے پر ہم چل رہے ہیں۔ کیا یہی راستہ بہتر ہے۔ یا اِس میں کچھ تبدیلی کی بھی ضرورت ہے ابتدا سے آخر تک جتنے بھی واقعات شلاً منادر، شیوالے اِن کے اِن کے پجاری اور بھگت تیرتھ استھان اور وہاں کے پنڈا لوگ یاترو۔ دانی، دان لینے والے برہمن سادھو وغیرہ

گاؤ شالائیں وہاں کے کرتا دھرتا اور گاؤ ایجی ٹیشن کے بانی مبانی ان سے میرا نہ کوئی ذاتی اختلاف ہے اور نہ ہی کسی قسم کی رنجش اور جو کچھ بھی تحریر کیا ہے ذرہ بھر بھی مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا گیا۔ تمام کے تمام واقعات میری آپ بیتی، سرگذشت کی ہی کڑیاں ہیں۔ مجھے ہندو دھرم اتنا ہی پیارا ہے جتنا اور جانی بھائیوں کو صرف اس ہندو دھرم کی بنیاد گائے ہی کی بہتری کے لئے رکھی گئی ہے جس کی رکھشا کرنے کے لئے ہمارے رشی منیوں نے جانیں تک قربان کر دیں۔ اور جس کا دکھ مٹانے کی خاطر رامائن، مہابھارت گیتا اور وید آدی کا ہر ورق بطور شہادت ہے۔ کہ کملاپتی بھگوان نارائن سے سکھوں کو تیاگ، ماں کو رکھشا کے لئے مرت لوک میں اوتار دھارن کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ مہابھارت میں تو یہاں تک تحریر ہے کہ یہ گائے تینتس کروڑ دیوتاؤں کے رہنے کی جگہ ہے اسی خیال کے زیر اثر ہندو بھائیوں نہیں، نہیں تمام بھارت باسی کیا مسلمان، عیسائی، سکھ، بدھ سے پد ارتھنا ہے کہ جب تک بھارت کی اصل ماں گائے کا اصل روپ میں پالن اور سدھار نہ ہوگا۔ تب تک بھارت اور بھارت کے نواسی سکھ نہیں پا سکتے مجھے کچھ ایسا خیال سا ہو گیا ہے یا یوں سمجھو کہ وہم سا ہو گیا ہوا ہے۔

میں نے قریباً قریباً تمام دھرم شاستروں کو پڑھے بڑے

پڑھ گیہ پرشوں سے سنا اور خود بھی یہاں تک میری ناقص عقل سے
پڑھا ہے ان تمام دھرم گرنتھوں میں گائے کی بہتری ہی لکھی ہوئی
ہے۔ اور ہندو دھرم کے بنیادی اصول کو گاؤ رکھشا ہی بتایا گیا ہے دیگر
مذہبی کتب گو انک گلے ہی کیوں؟ نامی کتاب سے جو کچھ معلوم ہوا
کہ تمام ہندو جنتا ان تین دیوتاؤں کو ماننے والی ہے برہما وشن
مہیش۔ اول برہما کو لیجئے آپکو وید رچیتا مانا گیا ہے اور اسی
وید میں گو ماتا کو جسطرح بیان کیا ہے سمجھدار انسان کو زیادہ سمجھانے
کی ضرورت نہیں منتر ملاحظہ ہو

मजा पीत

پورا شلوک نہیں لکھا لیکن اس کا مطلب ہے بھگوان! گائیں نے
جنہیں پالکر ہم سکھی ہوں دوئم وشنو جی مہاراج جنہوں نے اسکی رکھشا
کی خاطر اوتار دھارے پڑے راماں اوتار ہوا ہی ایسے خاندان
میں جسکے بزرگوں نے گائے نندنی کی خاطر شیر کو اپنے جسم کا
ماس دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ پھر آئے شری کرشن جی مہاراج
وہ تو آئے ہی گوالا بن کر۔ ان کا ارشاد ملاحظہ ہو

गावो

اس کا ارتھ ہے ادھر ادھر آگے پیچھے چاروں طرف میرے
گائیں ہی ہوں یہ خواہش تھی مادھو کی جس کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں
آج کا ہندو فخر سمجھتا ہے کیا آج کے ہندو نے ان کے اس

سنہری ارشاد پر بھی کبھی دھیان دیتے ہوئے گوالا بننے کی کوشش کی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ہزاروں ہی نہیں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں قصابوں کے ہاتھوں چمڑے کے بیوپار کے واسطے نہ ماری جاتیں اسی طرح دوسرے مہاپرشوں نے بھی اس مفید جانور کی کافی تعریف فرمائی ہے۔ مہارشی فرماتے ہیں

श्लोक

تمام سنسار کی دولت مندی کی جڑ صرف گائے ہی ہے اور گائے میں کوئی پاپ نہیں ہے۔ گائیں ہی منشیوں کے لئے اناج اور دیوتاؤں کے لئے آہوتی کو گھی دیتی ہیں۔ یہ تھے مہارشیوں کے اقوال۔ کہاں تک تحریر کروں اس کے لئے کافی وقت لگا کر کتاب لکھی جائے، تب بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ایک نہیں ہزاروں پراچین گرنتھوں میں اس کے لئے کافی مثالیں موجود ہیں۔ مہابھارت پدم پران وغیرہ میں تو گائے کو تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے رہنے کا مقام بنایا گیا ہے

خیر یہ بڑی دیرینہ باتیں ہیں آج سے کچھ دن پہلے سری گورونانک دیو جی مہاراج ومہرشی دیانند جی نے بھی اس کے لئے کافی کچھ کیا ہے۔ یہ بھی کا عرصہ کی بات ہے موجودہ دور کے پرم تیاگی ہندوستان کے اہنسا کے پجاری لنگوٹی بند شری باپو جی دو "مہاتما گاندھی" کا فرمان ہے۔

بھارت کا سکھ اور اس کی ترقی صرف گاؤ اور اسکی اولاد بیل کے

ساتھ یا واسطہ ہے اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو گاؤ رکھشا ہی ہندو دھرم کا بیرونی روپ ہے یعنی اس کی صحیح معنوں میں پالن ہی رکھشا ہے جیسے گوجر لوگ کرتے ہیں۔ جو ایسا کرتا ہے وہی سچا ہندو ہے پھر فرماتے ہیں۔ گئو رکھشا اور دودھ، دہی، مکھن کی زیادہ سے زیادہ پیداوار سوراج سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔"

شری مان پوجیہ پنڈت مدن موہن مالوی جی کا ارشاد ہے کہ اگر گاؤ جاتی کو نہ بچا سکے تو تمام ہندوؤں کو نیست و نابود ہونے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

شری ونوبا بھاوے جی فرماتے ہیں

بھارت ورش کسانوں کا ملک ہے گائے اور بیلوں کی اچھی نسل اور حفاظت پر ہی ہندوستان کی کھیتی باڑی کا انحصار ہے لیکن آج گائے کی حالت ہندوستان میں ان ملکوں سے بھی گئی گذری ہے جن ملکوں کو ہم کا نام تک نہ آتا تھا ہمیں سب کچھ یاد ہے لیکن کام الٹا کر رہے ہیں۔

شریمتی جانکی دیوی جی بزاز

گاؤ سیوا ہندو دھرم کا ایک ضروری حصہ ہے اگر اس وقت ہم تمام دیش باسی ملکر اسے نہ بچا سکے تو ہمارا دھرم اور جیون دونوں نشٹ ہو جائیں گے۔

شری گوبند بلبھ جی پنت ارشاد کرتے ہیں۔

کہ ہندو لوگ ہزاروں سالوں سے اسکو ماں کا درجہ دے چکے ہیں لیکن آج یہ حالت ہے کہ بے چاری کی کوئی سدھ نہیں لیتا یہ جنم سے لیکر مرنے کے بعد تک کی ساتھی مانی گئی ہے۔

دیش رتن منتری بابو راجندر پرشاد جی کا قول ہے۔

کہ بھارت میں گوپالن سناتن دھرم ہے تمام ملکوں سے زیادہ گائیں بھی اسی دیش میں ہی ہیں لیکن ان کی حالت اچھی نا ہونے کی کارن دودھ کی پیداوار بہت ہی کم ہے جب کہ بھارت کے مقابلہ میں دوسرے دیشوں میں گائیں کم ہیں لیکن اوسطاً دودھ زیادہ اس لیے اگلی سے ہم کو ان کے پالنے پوسنے میں پورا دھیان دینا چاہیئے۔

اسی طرح منتری شام پرشاد مکرجی، لالہ خوشحال چند سردار داتار سنگھ نے اس جانور کی بہتری کے لیے بہت کچھ کہا اور کیا یہ تو ہوئے بھارت کے رہنے والے نیتاؤں کے وچار اب چند ایک دوسرے مذہب ملکوں کے سجنوں کے وچار ملاحظہ ہوں۔

کوئی بھی انسان یا ملک گائے کے بنا اعلیٰ ترقی نہیں کر سکتا اس روئے زمین پر سب سے اچھی خوراک دودھ مکھن وغیرہ گائے ہی پیدا کرتی ہے جس ملک میں بہترین اور دودھارو ہوتی ہیں وہی ملک مذہب بنتا ہے زمین میں زیادہ پیداوار ہوتی ہے دولت بڑھتی ہے زمیندار مقروض نہیں رہتے اور اچھے گوالے

ہی بہترین دماغ بنانے والے معمار ہیں (الیفاً ہندی)

گاؤ بغیر تاج کی مہارانی ہے اس کا راج ساری دنیا پر ہے خدمت کرنا اس کا دھرم ہے اور جو کچھ وہ گھاس پات کھاتی ہے اس سے سوگنا زیادہ دیتی ہے شری مالک رام ایم۔ اے تین امریکہ بمبئی ملک کے گورنر تھوڑے سے گائے ماس کھانے والوں کے واسطے گاؤ کو ذبح کر کے جاری رکھنا اور دودھ کے استعمال کرنے والوں کی چلاہٹ نہ سننا یہ ایک بڑی حیرانی کی بات ہے کلکتہ ہائیکورٹ کے جج سر جان انڈرف اور کہاں تک فرض کروں ان مذکورہ بالا صاحبان، گاؤ پریمیوں کے مبارک ارشادات کلیان کے گوانک میں تفصیل تحریر ہیں ناظرین وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے طوالت کے خوف سے زیادہ تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا اب میری استدعا ہے کہ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنی چاہئے اور آئے دن کی دودھ مکھن گھی کی کمی کے سبب سے ہی آج ہمارا ملک عمر اور صحت کے لحاظ سے باقی تمام ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اور صحت کے لحاظ سے تو بالکل گر گیا ہے اس کا اندازہ پنجاب میں رہنے والوں سے لگ جاتا ہے وہ دیس جس میں دودھ دہی گھی اور مکھن کی کمی نہیں تھی۔ اب اس گاؤں کی طرف پورا دھیان نہ دینے کی وجہ سے آج پنجاب میں ۱۶ لاکھ انسان تپ دق میں مبتلا ہیں۔ اور دوسرے علاقوں کا کہنا ہی کیا اُن کا ظاہری سبب

صرف دودھ مکھن کی کمی ہی تو ہے۔ یہاں کے دوسرے ملکوں میں دودھ کی تمام پیداوار کو اُن ملکوں کی آبادی پر برابر تقسیم کیا جائے تو مندرجہ ذیل ہے

کنیڈا:- ۱۲ چھٹانک فی کس نیوزی لینڈ ۲۷½ چھٹانک سوئٹزرلینڈ ۲۴½ چھٹانک آسٹریلیا ۲۲½ چھٹانک انگلینڈ ۱۱½ چھٹانک جرمنی ۱۴½ چھٹانک امریکہ ۱۴½ چھٹانک اور گوپال کے پجاریوں کے ملک میں یعنی بھارت میں تحریر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے صرف تین چھٹانک فی کس نہ بھی جنگ (۱۹۳۵) کے زمانہ سے پہلے اب تو صرف دو چھٹانک سے بھی کم رہ گیا ہوگا۔ وہ بھی نخالص۔ برے دن کسی کے نہ آئیں۔ یہ وہی دیش ہے یہاں دودھ کی ندیاں بہا کرتی تھیں۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ اصلی دودھ دہی، گھی ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ اب اس ذکر کو یہیں خیرباد کہتے ہوئے امرتسر میں ہوئے گاؤ سمیلن مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۶ء کا ذکر بھی کر دوں۔

مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو زیدہم ۲۳۹۶/۴۶ برائے شمولیت کانفرنس ہند کا سمیلن ایک چٹھی موصول ہوئی اس میں ارشاد تھا۔ کہ میں بھی گاؤ رکھشا کے بارے میں تحریری بیان دوں۔ اس چٹھی کو پڑھ کر ازحد خوشی ہوئی اور میرے دیرینہ مرض پریشانی میں کچھ کمی بھی واقع ہوئی۔ جو کچھ ہم نے اس چٹھی کے جواب میں اپنی ناقص کے مطابق

تدابیر عرض کیں۔ عین درج ہیں اس سے قبل ناظرین کو یہ بتادوں کہ میں وہاں تک کیسے پہنچا اور کس طرح

مجھے دعوت نامہ بھی موصول ہوا تھا اور اس سمیلن میں شامل ہونے کے لیے میرے پریشان دل میں کافی سے زیادہ اُمنگ تھی۔ لیکن بوجہ قلیل آمدنی وہاں تک کے اخراجات برداشت کرنے کی مجھ غریب میں طاقت نہ تھی۔ اس لیے میں نے چند ایک سجنوں کے آگے اپنی مشکلات بیان بھی کیں۔ اور امداد کے لیے بھی کہا۔ اور انہوں نے مجھ سے وعدہ بھی کیا۔ لیکن موقعہ پر صاف جواب دے گئے (آج کا ہندو دھرم) وہی حال ہوا جو ہوتا تھا۔ لیکن اب کیا کیا جائے وہ مہاشکتی سب کی مرادیں پوری کرتی ہے۔ ایک غریب آدمی نے میری امداد کی جس کی مہربانی سے میں وہاں تک پہنچا ذکر تو کر رہا تھا چٹھی کا اور جو کچھ تحریر کی صورت میں وہاں بھیجا اصل چٹھی کی نقل درج ہے۔

شریمان پوجیہ بابا گورکھ سنگھ جی

"جے گؤ ماتا کی"

آپ کی دو چٹھات موصول ہوئیں جن کا تہ دل سے شکریہ اپنے خیالات کے مطابق گاؤ رکھشا کرنے سے ہی ہندوستان اور ہندوستانیوں کی اُنتی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کی اقتصادی مذہبی اور آزادی کا راز دودھ دہی اور گھی کی زیادہ سے زیادہ پیداوار

میں پوشیدہ ہے چنانچہ ابھی آدھار پر میں نے روشنی ڈالنی مناسب سمجھی ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ دھرم کے ناطے اس کی رکھشا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔
بھارت ایک کسانوں کا ملک ہے یہاں اناج کی پیداوار بڑھانے کی ضرورت ہے
یہ اصلی خوراک دودھ دہی مکھن کی پیداوار میں اضافہ کرنے اشد ضرورت ہے جانوروں کو اچھے طریقے سے پالا جائے اور سرمایہ دار لوگ اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس بیوپار پر صرف کریں۔ بڑے بڑے ڈیری فارم جاری کریں شہری آبادی کے لئے ڈرائی کیٹل فارم بنائیں تاکہ لوگ مویشی انفرادی طور پر بھی پال سکیں۔ غیر ملکوں میں انہی طریقوں پر عمل کیا جا رہا ہے انہیں طریقوں کو اپنائیں۔ یہ شرم کی بات ہے کہ جو ملک دوسرے علاقوں کو گھی سپلائی کرتا آج وہ ریاست گوالیار سے گھی منگوا رہی ہے۔

آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر مندرجہ ذیل تجاویز پر عملدر آمد کیا
جائے تو صحیح معنوں میں گاؤ رکھشا ہو سکتی ہے

۱۔ گاؤ بھگتوں کو کچھ عرصہ کے لئے گوشت کھانا چھوڑ دینا چاہئے جس
سے گوشت خوروں کے لئے بھیڑ بکری کی کمی نہ رہے اگر پورے طور پر
نہ چھوڑ سکیں تو کم از کم دودھ دینے والے جانوروں کو ہضم نہ کریں۔

۲۔ ضرورت سے زیادہ چمڑے کی اشیاء کا کم استعمال کیا جائے
جہاں تک ہو سکے خود مرے ہوئے جانوروں کی کھالوں سے ہی بنی ہوئی
اشیاء کا استعمال کریں۔ زیادہ سے زیادہ گھی دودھ بڑھانے کے ذرائع
کے لئے اپنی دولت کا کچھ نہ کچھ حصہ جو چمڑے اور موٹر کی
انڈسٹری کو بڑھاوا دینے کے لئے بلا دریغ لگایا جا رہا ہے وہ
قومی ڈیری فارم کی انڈسٹری پر صرف کیا جائے۔ تب ہی گائے کے
بچنے کی کافی امید کی جا سکتی ہے۔

۳۔ اگر سچے گاؤ بھگت چاہیں تو پانچ سال کے لئے مندروں کی آمدنی
اور دوسرے قسم کے دانوں کی آمدنی سے ایسے ڈرائی کیٹل فارم اور
مویشیوں کے علاج کے لئے شفاخانے اور ڈسپنسریاں کھولی جا سکتی ہیں۔
جن میں بیمار جانوروں کا علاج اور ڈرائی کیٹل فارموں میں شہر کے رہنے
والوں کے لئے اپنی گائیں دودھ سوکھ جانے کے بعد چار پانچ روپے

ماہوار خرچ پر دوسرے میاں (سو سے تک) گائیں پرورش پاسکیں تاکہ
اس سہولیت سے فائدہ اٹھاکر مویشی پالنے کا شوق بڑھے۔

ہر اناج سے لیکر جانوروں تک بلکہ انسان تک اچھی قسم اور اچھی نسل
ہی بڑھانا پاسکتی ہے نسل سدھار قیمت بڑھانے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔
یہاں تو بکری کی قیمت بھی گائے سے کئی گنا زیادہ ہے منافع خور اچھائی
برائی نہیں پہچانے گے۔ دولت کی حرص انسان کو پاگل بنا دیتی ہے منافع
خور کو منافع سے غرض ہے چاہے سونے کی سمگلنگ سے یا ناجائز
شراب کی کشیدگی سے۔ قصاب کو اس پشو سے خدا لگتی کا بیر نہیں یہی
منافع خوری اسے اس دھندے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

۵۔ بیکار، ڈھولک باجے کھرتال کی تال پر گوپال کو بلانے والے
اگر اس جانور کے پالنے کا دھندہ اپنالیں تو گوپال کی پرورشن پانا بہت
آسان ہے۔ گائے کے نام پر سیاسی یا ذاتی مفاد کے لئے دھرم
کا ڈھنڈورا پیٹنا گائے اور قوم کے لئے نقصان دہ ہے۔